ISSN 0971-9288

www.urdubookreview.in

عام شمارہ
₹ 80

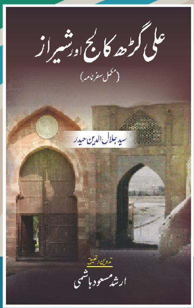

اردو بک ریویو

اپریل - مئی - جون 2026

کیا سمجھتے ہو جام خالی ہے؟ پھر چھلکنے لگے سُبو، آؤ

— اسرار ناروی (ابن صفی) [آمد: اپریل 1928 (بروز جمعہ) — رخصت: 26 جولائی 1980]

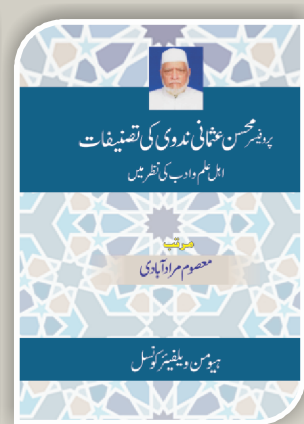

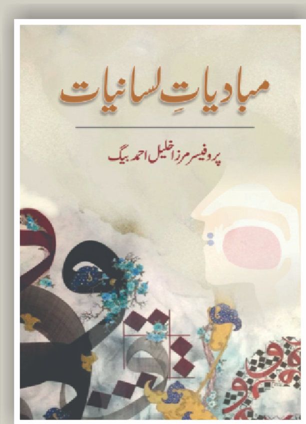

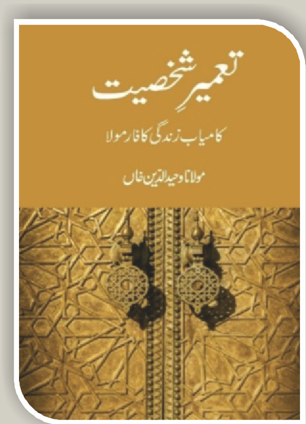

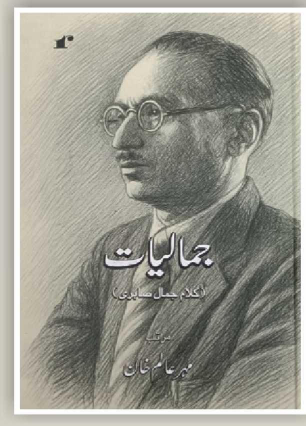

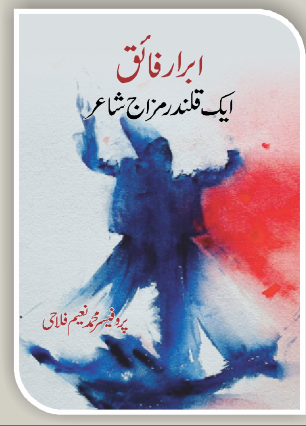

اسیم کاویانی کی ایک اہم تنقیدی اور تحقیقی کتاب

اکبر الٰہ آبادی: اپنی شکست کی آواز

(دوسرا اڈیشن قدرے اضافے کے ساتھ)

قیمت: 500 روپیے   صفحات: 320 (مجلد)   رابطہ: 9953630788, 9869321477

معروف ناقدین کی آراء

ڈاکٹر سرور حسین:

اسیم کاویانی کا زیرِ نظر مقالہ ان معنوں میں قابلِ قدر کہا جائے گا کہ بعض معروف اہلِ قلم کی جانب سے اکبر کو حریت پسند اور قوم پرست ثابت کرنے کی جو کوششیں منصۂ شہود پر آئیں؛ وہ اکبر کے قد کو تو بلند نہ کر سکیں؛ لیکن خود اُن فاضل مصنفین کے قد کو ضرور متنازعہ بنا دیا۔ زیرِ نظر کتاب میں اسیم کاویانی نے شمس الرحمن فاروقی، فضیل جعفری اور اصغر عباس جیسے قلم کاروں کے ذریعے اکبر کو نیشنلسٹ ثابت کرنے کی سعیِ ناکام کی سخت گرفت کی ہے۔ اکبر کے کلام پر تحقیقی کام کرنے والے محققین کے لیے بھی یہ کتاب انتہائی کارآمد نظر آتی ہے۔ (سہ ماہی 'عالمی فلک' دھنباد، اکتوبر تا دسمبر 2021)

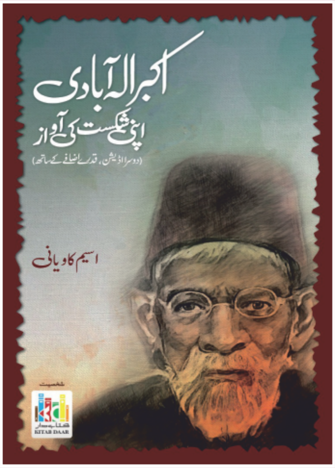

الطاف انجم:

متذکرہ بالا۔۔مضمون نگاروں نے جو آراء قائم کی ہیں؛ اُن پر جس انداز میں اسیم کاویانی نے ضربیں لگائی ہیں؛ وہ قابلِ مطالعہ ہیں۔ دراصل ادبی مقتدرہ کے خلاف کچھ کہنا یا لکھنا بڑے مجاہدے کا کام ہوتا ہے۔۔۔ اس کتاب میں اسلوبیاتی خوبیاں اتنی اور ایسی ہیں کہ قاری قدم قدم پر مصنف کے اندازِ نگارش کی داد دیے بِنا نہیں رہتا۔ اسیم کاویانی فی زمانہ اردو کے معدودے چند قلم کاروں میں شمار کیے جاتے ہیں؛ جن کی شناخت ایک جیّد محقق اور زبان و اسلوب کے شناور کے بطور ہوتی ہے۔۔۔ غرض کہ اسیم کاویانی کی زیرِ تجزیہ کتاب اردو میں اکبریات کا ایک نیا ڈسکورس قائم کرتی ہے۔۔۔ (اقتباس مضمون: 'ادبی مجتہدین بنام ادبی مقتدرہ')

حقانی القاسمی:

اکبر الٰہ آبادی (16 نومبر 1846۔ 9 دسمبر 1921) اردو کے ایک ایسے شاعر ہیں؛ جن کے افکار و اقدار کے حوالے سے بہت سے تنقیدی اور تحقیقی مطالعات سامنے آچکے ہیں۔۔۔۔۔۔۔؛ جن میں۔۔اسیم کاویانی کی 2021 میں شائع ہوئی تازہ ترین کتاب اس لحاظ سے بہت وقیع ہے کہ انھوں نے اکبر کے تعلق سے بہت سے عالمانہ بیانات کو دلائل کے ذریعے مسترد کیا ہے اور اکبر کی شاعری اور شخصیت کے تعلق سے الگ زاویۂ نظر پیش کیا ہے۔ (ماہ نامہ 'اردو دنیا' نئی دہلی، اپریل 2022)

نصر اللہ نصر:

اسیم کاویانی کی ادبی شخصیت محتاجِ تعارف نہیں۔ جہانِ ادب، ان کے گراں قدر نام اور گراں قدر ادبی خدمات سے بخوبی واقف ہے۔۔۔ وہ ہوا میں تیر نہیں چھوڑتے بلکہ کافی مطالعے اور مشاہدے کے بعد ہی قلم کو جنبش دیتے ہیں۔۔۔ اکبر الٰہ آبادی کی شاعری کو سمجھنے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ لازمی ہے۔ ('ماہ نامہ انشا' کلکتہ، مارچ، اپریل 2022)

Advtt. 01/2026

انتباہ: یہ کتاب اکبر کے مبتدیوں کے لیے نہیں ہے۔

Website: www.urdubookreview.in

سہ ماہی

اردو بک ریویو

ISSN 0971-9288

URDU BOOK REVIEW

جلد: XXXII شمارہ: 46 اپریل، مئی، جون: 2026

ذی قعدہ، ذی الحجہ، محرم الحرام ۱۴۴۷-۱۴۴۸ ہجری

مدیر

محمّد عارف اقبال

مدیر اعزازی

ڈاکٹر سیّد تنویر حسین

سرکولیشن مینیجر

ندیم عارف

Mobile: 9953067664

مجلس ادارت

☆ ڈاکٹر شمس بدایونی (بریلی) ☆ اے۔یو۔آصف (نئی دہلی)

☆ شفیق الرحمٰن (نئی دہلی) ☆ طاہر نقوی (نوئیڈا، NCR)

☆ سعید اختر اعظمی (ریاض، سعودی عرب)

مجلس مشاورت

☆ کاشف الہدیٰ (USA) ☆ رضوان احمد فلاحی (لندن)

☆ پروفیسر خالد محمود (نئی دہلی) ☆ ادریس احمد خاں (دہلی)

☆ ڈاکٹر محمد قطب الدین ابوشجاع (انڈیانا، USA)

☆ محمد معین الدین حبیبی (سابق اسسٹنٹ رجسٹرار، JMI، نئی دہلی)

☆ عارف محمود انصاری (مسقط، عمان)

☆ شاہ حسین نہری (اورنگ آباد، مہاراشٹر)

☆ احمد ابوسعید (حیدرآباد) ☆ سلمان غازی (ممبئی)

☆ ڈاکٹر سیّد احمد خاں (نئی دہلی) ☆ پروفیسر ارتضیٰ کریم (دہلی)

☆ انتخاب عالم انصاری (ممبرا، تھانے)

☆ عبدالرحمٰن صدیقی (ممبئی) ☆ اعزاز حسن (دہلی)

ممبر آل انڈیا اردو ایڈیٹرز کانفرنس

Under UGC Care List

Member, Press Club of India, New Delhi

قیمت

عام شمارہ (اسٹینڈ قیمت) : 80/-

سالانہ (عام بذریعہ سادہ ڈاک) : 300/-

سالانہ (عام اسپیڈ پوسٹ) : 600/-

سالانہ (کتب خانے و ادارے) : 750/- (اسپیڈ پوسٹ)

تاحیات (ہندوستان) : 7000/-

بیرون ملک

: 35 امریکی ڈالر (سالانہ)

: 500 یو ایس ڈالر تاحیات

آن لائن رقم ٹرانسفر کرنے کے لیے

Mohammad Arif Iqbal

Current A/c No. 33469561425

State Bank of India, Jama Masjid Delhi

IFSC: SBIN0002366

بینک ڈرافٹ یا ملٹی سٹی چیک پر صرف

"URDU BOOK REVIEW"

تحریر کریں۔

Registered Office

URDU BOOK REVIEW

1739/3 (Basement) New Kohinoor Hotel

Pataudi House, Darya Ganj, New Delhi-2

ترسیل زر اور ادارتی و انتظامی امور میں رابطے کا پتہ

2878, Ist Floor, Gali Captain Wali

Kucha Chellan, Darya Ganj

New Delhi-110002 Ph: [O] 011-44753890

[M] +91 9953630788 +91 9899506816

Email: urdubookreview1995@gmail.com

کمپیوٹر کمپوزنگ: اردو بک ریویو، ڈی ٹی پی ڈویژن

کمپوزیٹر: محمد عمران

Printer, Publisher and Editor: Mohammad Arif Iqbal

پرنٹر، پبلشر اور اونر محمد عارف اقبال نے اصیلا آفسیٹ پرنٹرز، 08-1307، کلاں محل، دریا گنج، نئی دہلی-2 سے چھپوا کر دفتر اردو بک ریویو، 1739/3، (ذیلی منزل)، نیو کوہ نور ہوٹل، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی-2 سے شائع کیا۔

ترتیب

اداریہ: • قوموں کی حیات میں مادری زبان کا مقام 03-04
عرضِ ناشر: کتابوں پر تبصرے کی روشن روایت 05
قارئین کے تاثرات 07-08
بلا تبصرہ: بہار کی بہار، از: علامہ عبدالماجد دریابادی 09-11
نقد و نظر: غالب ثنائے خواجہ: ایک تاثر 13-14
از: ڈاکٹر شمس بدایونی
علم و ادب: ہم برعظیم کے باسی ہیں یا برصغیر کے 15-16
احمد حاطب صدیقی [ابونثر]
کتاب زندگی 17-20
• مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی (پھلواری شریف، پٹنہ) 17-18
• نذیر فتح پوری (پونے، مہاراشٹر) 19-20
سیر حاصل: (مفصّل تبصرہ) 21-29
• مبادیاتِ لسانیات (پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ) 21-24
• دنیا عورت کی نظر میں (مشرق و مغرب کا سفرنامہ) 25-29
نقد و تبصرہ 31-59
• علی گڑھ کالج اور شیراز (مکمل سفرنامہ، سیّد جلال الدین حیدر) 31
• پروفیسر محسن عثمانی ندوی کی تصنیفات (اہل علم و ادب کی نظر میں) 33
• تعمیر شخصیت: کامیاب زندگی کا فارمولا 37
• مولانا ابوالکلام آزاد (سہیل انجم) 39
• ابرار فائق: ایک قلندر مزاج شاعر (ڈاکٹر محمد نعیم فلاحی) 40
• سندیلہ کے مشاہیر شعرا (ڈاکٹر سعید احمد سندیلوی) 42
• پروفیسر ممتاز احمد کی ادبی خدمات (ڈاکٹر خالد سجاد) 45
• شاعری میں شہر جونپور (محمد عرفان جونپوری) 47
• تفہیم و تعبیر (ادبی، تحقیقی، تنقیدی مضامین) 49
• ماہنامہ بندگی ربّ (محمد رشاد رفعت) 50
• معیار و میزان (رشید حسن خاں کی کتابوں پر تبصرے اور تجزیے) 52
• فرنگ کا قیدی (تاریخی فکشن) 54
• عصمت چغتائی کا افسانوی فن 57
• حدوں سے آگے (افسانے، ڈاکٹر محمد مستمر) 58

جائزہ: اردو کتب و رسائل 61-65
• شیعہ سُنّی اتحاد (پروفیسر محسن عثمانی ندوی) 61
• عبدالعزیز خالد کی منظوم تمثیل نگاری 62
• یادگار مجلّہ، عالمی یوم یونانی میڈیسن 2026 63
(خصوصی گوشہ: ڈاکٹر محمد فضل الرحمٰن شرر مصباحی)
• رہنمائے علم الصیدلہ 64
• نشانِ راہ (کتابی سلسلہ ۵) 65
شعری ادب: (مجموعہ کلام) 67-74
• گل کنج (کلیاتِ شاہ) 67
• جمالیات (کلام جمال صابری) 70
• برمحل اشعار/ زبان زد اشعار اور ان کے ماخذ (جلد دوم) 72
وفیات [Obituaries]: 75-92
• پروفیسر احمد سجاد (75)
• بشیر بدر (76)
• سیّد شاہ حسین نہری (78)
• ڈاکٹر محمد فیروز دہلوی (79)
• الطاف حسن قریشی (80)
• ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری (81)
• پروفیسر محمد شاہد حسین (82)
• امین الدین ابوالحسن (82)
• ڈاکٹر محمد گوہر (83) • محسنہ قدوائی (84)
• محترمہ ثمینہ سیّد (84)
• کے ایل نارنگ ساقی (85)
• فاروق سیّد (85) • امیر اللہ عنبر خلیقی (87)
• ببّن خاں (87) • آصف صفوی (88)
• شبیر احمد انصاری (89) • اسحاق اثر (90)
• ڈاکٹر سیّد محمد حامد (90) • ڈاکٹر محمد نصیر الدین (91)
• محمد احمد (92) • ڈاکٹر عمر چھاپرا (92)
نئی کتب: [New Arrivals] 93-95

مضمون نگار یا مبصر کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قوموں کی حیات میں مادری زبان کا مقام

قوموں کی حیات میں مادری زبان کا مقام بدن میں قلب کی طرح ہے۔ مادری زبان اگر ہماری علمی زبان نہیں ہے تو سمجھ لیجیے کہ ہماری حالت اس دائمی اپاہج کی ہے جس کی تمام تگ و دَو بیساکھی کے سہارے ہوتی ہے اور وہ تاحیات بیساکھی کا غلام بنا رہتا ہے — اور غلامی کی نفسیات میں پلنے والی نسلیں کارنامے انجام نہیں دیا کرتیں — ''کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر۔''

قوموں کا ضمیر جب غلامی میں بدل جاتا ہے تو کیا کیا گُل کھلاتا ہے، اس کا مشاہدہ آج دنیا کے تمام ''غلام ملکوں'' میں کیا جاسکتا ہے۔ تاہم برعظیم کے تناظر میں یہ کیفیت کچھ زیادہ ہی تشویش ناک ہے۔ چند سال قبل جب آئی آئی ٹی دہلی کے ایک طالب علم نے اپنے پی ایچ – ڈی کا مقالہ ہندی زبان میں تحریر کیا تو ادارہ نے اسے قبول کرنے سے انکار کردیا۔ بالآخر اس طالب علم کو عدالت کے دروازے پر دستک دینی پڑی، اس کے بعد عدالت کے حکم سے اسے راحت ملی۔

ہمارے ملک کے عوام کی مادری اور علمی زبان کون سی ہے، ہمیں ابھی تک نہیں معلوم ہے۔ البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ انگریزی سے پیچھا چھڑانا شاید اب ہمارے بس میں نہیں ہے۔ زبان اور تہذیب وثقافت کے مبلغین سیاسی بازی گروں سے ذرا دریافت کیجیے کہ ان کے ملک میں غیر ملکی طلبا کے لیے میڈیم آف ایجوکیشن ہندوستانی زبان کیوں نہیں ہے۔ چند برس قبل آئی آئی ٹی دہلی کے ایک طالب علم ایم ٹِک کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے انگلینڈ (U.K.) جانے والے تھے تو ان کو انگریزی جاننے کے باوجود پانچ ہزار الفاظ پر مشتمل ڈکشنری یاد کرنے کے لیے دی گئی۔ انٹرویو کے بعد ہی وہاں ان کا داخلہ ممکن ہوسکا۔ ظاہر ہے کہ انگریزی وہاں کی مادری زبان ہے اور وہاں کی حکومت کو اس کا حق ہے کہ کوئی بھی غیر ملکی طالب علم وہاں کی زبان پر اتنا عبور رکھے کہ ترسیل وابلاغ کا مسئلہ نہ رہے۔ لیکن برعظیم کے پس ماندہ ممالک میں زبان کے لحاظ سے اب تک اپنی شناخت قائم نہیں ہوسکی ہے۔ یہاں کی تعلیمی و علمی زبان آج بھی غیر ملکی ہے جس سے ہمارے ملک کے باشندے فکری وتہذیبی اعتبار سے کبھی مانوس نہیں ہوئے۔ لہٰذا ذہنی پس ماندگی کے شکار رہے۔ ان کے مادری تعلیمی حق پر اس طرح شب خون مارا گیا کہ سائنس اور ٹکنالوجی کی ہوس نے انھیں کلّی طور پر انگریزی میڈیم کا غلام بنا دیا۔

انگریزوں کی تقریباً تین سوسالہ غلامی میں بھی زبان وتہذیب کے اعتبار سے ہندوستان اتنا بے بس نہیں ہوا تھا جتنا کہ آج ہے۔ اُس زمانے میں غیر ملکیوں نے یہاں کی زبانیں سیکھیں حتیٰ کہ عربی، فارسی اور سنسکرت و پالی کے عالم بھی ہوئے۔ 1947 کے بعد ایسا لگتا ہے کہ ہماری زبان ہی نہیں بلکہ تہذیب وثقافت کا سرا بھی ہمارے ہاتھ سے جاتا رہا۔ ہم آپس میں جو کبھی شیر وشکر تھے، ایک دوسرے کو شک کی نگاہوں سے دیکھتے رہے حتیٰ کہ اپنے پڑوسی کو بھی پہچاننے سے انکار کردیا۔

واضح ہو کہ دنیا کی کسی بھی زبان سے ہمیں بیر نہیں ہے۔ وہ اہل علم جو ایک سے زائد زبانوں کے جاننے والے یا عالم ہیں تو ہم ان کو انتہائی ادب واحترام اور عقیدت سے دیکھتے ہیں۔ یہ لوگ قیمتی سرمایہ ہیں۔

ملک میں جب تک مادری اور ملکی علمی زبان کو تفوق حاصل نہیں ہوگا، نظام تعلیم کے بنیادی ڈھانچے کو استحکام ملنا ناممکنات میں سے ہے۔ اس کے برعکس ملک کے حقیقی باشندوں کی مرضی کے خلاف انگریزی کو مادری علمی زبان کا درجہ دینا نہ صرف ملک کے مفاد کے خلاف ہے بلکہ انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہے۔ غلامی کی علامت انگریزی زبان کے

شوبز نے ہمارے علمی، تعلیمی وتہذیبی سرمائے کو جتنا نقصان پہنچایا ہے، اس کا تصور کرنا بھی محال ہے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہمارے مدبرین نے، جن میں آکسفرڈ کے بھی فارغین تھے، زبان کے اس حساس مسئلہ پر غور نہیں کیا ہوگا یا ان کے سامنے دنیا کے ان ممالک کے ماڈیول نہیں ہوں گے جہاں میڈیم آف ایجوکیشن مادری زبان ہے۔ ان میں سے چند نام جرمنی، فرانس، اٹلی، اسپین، آسٹریا، ہالینڈ، چین، جاپان اور کوریا وغیرہ کے لیے جاسکتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ انگریزوں کی غلامی سے نجات حاصل کرنے والے ملکوں کے مدبرین کو اس بات پر مجبور کیا گیا کہ وہ اپنے ملک کے باشندوں پر انگریزی زبان کو تھوپ دیں تا کہ مستقبل قریب میں ذہنی، فکری اور تعلیمی اعتبار سے وہ انہی کے ملازم بن جائیں۔ یہ گویا مغربی استعمار کے منصوبے کا حصہ تھا کہ پس ماندہ ممالک سے بظاہر پڑھے لکھے مین پاور (Man-power) انہیں ملتے رہیں۔ بحالت مجبوری ہی سہی، یہ ایسی تاریخی غلطی تھی جس کا خمیازہ کئی نسلیں بھگت چکی ہیں اور آئندہ بھی انہیں بھگتنا پڑے گا۔ اب بھی ہم اپنے بزرگ مدبرین کی غلطیوں کو سدھار سکتے ہیں اور از سرِ نو اپنی تہذیب وثقافت اور تباہی کا احساس کرتے ہوئے ان لوگوں کے احسانات کو یاد کر سکتے ہیں جنہوں نے ہندوستان میں انگریزوں سے کہیں زیادہ حکومت کی لیکن انگریزوں کی طرح انہوں نے ہندوستان کو لوٹا نہیں۔ ہاں ان سے تاریخ میں بعض غیر مدبرانہ غلطیاں ضرور ہوئی ہوں گی کہ جیسا کہ اندرا گاندھی سے بھنڈران والا کے معاملے میں ہوا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ کسی کی اہم خوبیوں کو یکسر نظر انداز کر دیا جائے اور ان کی خدماتِ جلیلہ پر پانی پھیر دیا جائے۔ انگریزوں سے قبل کے حکمرانوں نے اس ملک کی مٹی کی حفاظت کی، اسے سنوارا، سجایا اور تہذیب وشائستگی کا گہوارہ بنایا۔ انہوں نے ملک کے باشندوں کو آزادی دی کہ وہ اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کریں۔ دربار کی علمی زبان کی تشکیل میں اس بات کا خاص خیال رکھا کہ وہ اپنی صوتیات (phonems) یعنی مصوتوں اور مصمتوں کو نہ صرف مضبوط رکھنے پر قدرت رکھتی ہو بلکہ دنیا کی زیادہ سے زیادہ زبانوں کے صوتیوں کو بھی بعینہٖ مضبوط ومرسوم رکھنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ مگر افسوس کہ 1947 کی نام نہاد آزادی نے ہندوستان کا نقشہ ہی بدل دیا اور یہ کام منصوبہ بند طریقے سے انجام دیا گیا۔

معروف صحافی اور دانشور سیّد محمد عالم نقوی (وفات:3 اکتوبر 2024) نے اپنے 8 اگست (2012) کے ایک اداریہ (اودھ نامہ لکھنؤ) میں مادری زبان کے حوالے سے لکھا تھا:

> ’’... ایران نے 1979 میں اسلامی انقلاب کے بعد جب سے اپنی قومی زبان فارسی کے ذریعے نرسری سے اعلیٰ سائنسی اور تکنیکی تعلیم کا نظم کیا ہے، ان کی سائنسی اور علمی ترقی کا یہ عالم ہے کہ ہر سال کسی نہ کسی شعبہ میں کوئی نہ کوئی عالمی ایوارڈ کی دوڑ میں جانے والا سائنس داں ضرور میسر آجاتا ہے۔ خلائی سائنس اور نیوکلیر سائنس میں تو ایران آج مغربی طاقتوں کے برابر کھڑا ہے۔ یہاں تک کہ جنوبی (لاطینی) امریکہ کے اُبھرتے ہوئے ممالک میں بھی جو روز بروز ترقی کر رہے ہیں، ان کی مادری زبان میں تعلیم کا نظم ہے، کسی غیر ملکی زبان میں نہیں۔ یہ صرف ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش اور افریقہ کے پس ماندہ ممالک ہیں جہاں انگریزی میڈیم کا عذاب نافذ ہے۔ نتیجہ سامنے ہے!‘‘

حیاتِ تازہ اپنے ساتھ لائی لذتیں کیا کیا
رقابت، خود فروشی، ناشکیبائی، ہوس ناکی —(بانگِ درا)

11 جون 2026

——— محمد عارف اقبال

عرض ناشر

کتابوں پر تبصرے کی روشن روایت

اردو دنیا اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ 'اردو بک ریویو' نے کتابوں پر تبصرے کی روایت کو راسخ اور روشن کرنے میں گزشتہ 31 برسوں سے اہم کردار ادا کیا ہے۔ 'اردو بک ریویو' کے مبصرین کے اس قافلے میں جن بڑے ادیبوں نے ہمیشہ ہمارا ساتھ دیا ہے، ایک ایک کر کے وہ ہم سے رخصت ہو گئے۔ ان میں معروف محقق اور افسانہ نگار محمود عالم (پٹنہ)، ڈاکٹر منور حسین فلاحی (اے ایم یو، علی گڑھ)، ڈاکٹر عبدالمغنی (پٹنہ)، ڈاکٹر خلیق انجم (انجمن ترقی اردو ہند)، ڈاکٹر محمود حسن الہ آبادی (بھیونڈی)، حاذق ضیائی سہسرامی (سہسرام)، ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی (سابق استاذ اے ایم یو، علی گڑھ)، سیّد لطیف حسین ادیب (محقق و ادیب)، (مولانا) محمد فاروق خاں (ہندی مترجم قرآن مجید)، ڈاکٹر منظر اعجاز (سابق پروفیسر شعبہ اردو، پٹنہ یونیورسٹی) شامل ہیں۔ اب ڈاکٹر محمد فیروز دہلوی نے بھی الوداع کہہ دیا۔ 'اردو بک ریویو' کے لیے ان کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ اللہ تعالیٰ مرحومین کی مغفرت فرما کر ان کے درجات بلند کرے۔ آمین! مذکورہ بالا مبصرین میں ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی کا نام اس طور نمایاں ہے کہ ان کے لکھے تبصرے پر مشتمل باضابطہ کتاب منظر عام پر آئی جس کا اجرا 8 اپریل 2011 کو اس وقت کے نائب صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر حامد انصاری نے کیا تھا۔ ڈاکٹر حامد انصاری، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی کے شاگرد رشید بھی رہے۔

اِس وقت جبکہ کتابوں کے مطالعہ کا ذوق کم ترین درجے پر پہنچ گیا ہے اور مبصرین بھی کم ہو گئے ہیں، شکر ربّی کہ ادارے کو تعاون دینے والے مبصرین کی معتدبہ تعداد اَب بھی موجود ہے۔ اچھی کتابیں اگرچہ کم لکھی جا رہی ہیں، اس کے باوجود الحمدللہ 'اردو بک ریویو' کے سنجیدہ قارئین نے ادارے سے اپنا رشتہ مستحکم رکھا ہے۔ یہی وہ مثبت رویہ ہے جس کی وجہ سے زوال کے باوجود علم و ادب کا بازار قائم ہے۔ ہمارے متعدد قارئین نے اپنے گھر کو ہی کتب خانہ بنا رکھا ہے۔ یہ علامت ہے اس روشن مستقبل کی جس کی تلاش میں نئی نسل کو اِن شاء اللہ کبھی مایوسی نہیں ہوگی۔ کل یہی نسل تھی جس کی عمر اب پچاس ساٹھ سے زائد ہو رہی ہے، اردو میں ناول، افسانے پڑھ پڑھ کر اردو زبان اور ادب کو حیات بخشنے میں اس نسل نے اہم کردار ادا کیا۔ حال ہی میں انجمن ترقی اردو ہند کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر اطہر فاروقی کا 'اردو تعلیم' کے موضوع پر ایک مضمون (روزنامہ انقلاب، 10 مئی 2026) شائع ہوا ہے۔ اس مضمون کے مطالعہ سے مجموعی تاثر اگرچہ مثبت ہے لیکن اپنے مضمون کا ایک پیرا اطہر فاروقی نے پتہ نہیں کس ذہنی کیفیت میں لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''دن میں اردو میڈیم سے جامعہ عثمانیہ کے احیا کا خواب دیکھنے میں اس طرح کوئی برائی البتہ نہیں ہے جس طرح صادق سردھنوی اور نسیم حجازی کے ناول آپ کو اُس دنیا میں لے جاتے ہیں جو محض چنڈو خانے میں کیے جانے والے نشے کے مترادف ہے۔''

کسی تاریخی ادبی ناول نگار سے فکری و نظریاتی اختلاف تو کیا جا سکتا ہے لیکن اس کی ناقابل فراموش ادبی خدمات پر رکیک حملہ کرنا کم سے کم اطہر فاروقی کو زیب نہیں دیتا۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ سطریں لکھتے وقت شاید وہ دانشورانہ ادبی تکبر کے شکار ہو گئے ہیں۔

محترم قارئین سے التماس ہے کہ مجلہ کے مشمولات پر اپنی گراں قدر رائے یا تاثر سے ادارے کو ضرور باخبر کرتے رہیں۔ وہ اپنی رائے بذریعہ واٹس ایپ بھی ہمیں ارسال کر سکتے ہیں۔

16 مئی 2026

—— محمد عارف اقبال
Mobile: 09953630788

THE GLORIOUS QURAN

دی گلوریس قرآن

مستند ابتدائی مآخذ پر مبنی تشریحات کے ساتھ نیا انگریزی ترجمہ قرآن

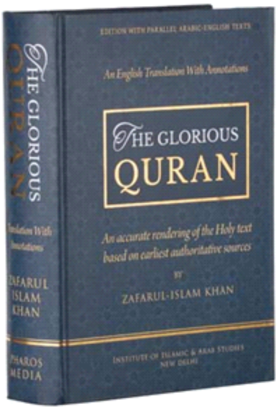

اسلام کی مقدس کتاب قرآن مجید کا درست ترین اور سلیس انگریزی ترجمہ، جس میں قرآن مجید کی تاریخ اور مسائل سمیت متعلقہ موضوعات پر وسیع تشریحات اور ضمیمے، سیرت محمدی ﷺ، اسماء اللہ الحسنیٰ، قرآن میں مذکور انبیاء علیہم السلام کا مختصر تعارف، اسلامی اصطلاحات پر مبنی لغت اور قرآن کا موضوعاتی اشاریہ شامل ہیں۔ یہ سب انتہائی مستند ابتدائی عربی مآخذ پر مبنی ہے۔ قرآن اور اسلام کو سمجھنے کے لیے ایک مکمل اور مستند دستاویز۔ 11 سال کی محنت کا نتیجہ۔

ترجمہ، تشریحی حواشی اور ضمائم: ڈاکٹر ظفر الاسلام خان

مترجم نے ہندوستانی مدارس میں تعلیم حاصل کی۔ بعد ازاں جامعۃ الازہر اور قاہرہ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی اور مانچسٹر یونیورسٹی (انگلینڈ) سے 1987ء میں اسلامیات میں پی ایچ۔ ڈی کی۔ وہ عربی، انگریزی اور اردو میں 50 سے زیادہ کتابوں کے مصنف اور مترجم ہیں۔

انگریزی ترجمہ قرآن بشمول عربی متن، 1216 صفحات (مجلد/ ڈبل کلر)۔
ہندوستان: 1195 ⁄روپے / بیرون ممالک: 48 USD (ڈاک/کوریئر فری)
صرف انگریزی ایڈیشن، 816 صفحات (مجلد/ بلیک اینڈ وھائٹ)۔
ہندوستان: 795 ⁄روپے / بیرون ممالک: 38 USD (ڈاک/کوریئر فری)

PHAROS MEDIA & PUBLISHING PVT LTD
New Delhi
Email: books@pharosmedia.com
Mobile/WhatsApp: +91-98686-56614, +91-98181-20669;
or visit: www.pharosmedia.com

Advtt. 02/2026

قارئین کے تاثرات

□... تازہ 'اردو بک ریویو' (جنوری تا مارچ 2026) موصول ہوا۔ شکریہ! علامہ اقبال اور بھاگوت جی کے تعلق سے آپ کی تحریر پڑھی۔ ہندوستان میں 'علامہ اقبال کو نظریۂ پاکستان کا خالق سمجھنا...'' اس ٹکڑے نے آنجہانی وزیراعظم مرار جی دیسائی کی یاد دلادی، وہ بھی اسی طرح کی باتیں کرتے تھے۔ کسی نے جب ان کو اقبال کے ترانے ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا کی طرف متوجہ کیا تو وہ خموش ہوگئے۔ یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مرار جی ہی اولین ہندوستانی تھے کہ جن کو پاکستان کا قومی اعزاز (ستارہ امتیاز) دیا گیا۔ لیکن ہم جیسے یہ بھی سمجھتے ہیں کہ ہندوستان میں اقبال پر تنقید کے ساتھ ساتھ انہیں تسلیم بھی کیا گیا جس کی ایک مثال جامعہ کلکتہ میں ''اقبال چیئر'' کا قیام بھی ہے اور بات اسی پر تمام نہیں ہوئی کہ اس چیئر کے سربراہ کے طور پر پاکستان ہی کے ایک ممتاز ترین شاعر فیض احمد فیض کو منتخب کیا گیا، ہر چند کہ وہ کسی سبب اس چیئر کے صدر نشین نہیں ہو سکے مگر اقبال کے نام سے بنگال میں یہ چیئر قائم ہوئی اور اس کی سربراہی ہمارے ممتاز شاعر مظفر حنفی کے حصے میں آئی۔ اب ملک کی جو فضا بنی ہوئی ہے اس میں تو کچھ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ جب (سابق) صدر جمہوریہ فخرالدین علی احمد کا نام بھی لوگوں کے لیے ناقابل قبول ہوگیا ہے مگر تعصب صرف برادرانِ وطن تک محدود نہیں ہم بھی کسی نہ کسی سطح پر اپنے ہی لوگوں کے ساتھ اس فعلِ قبیح کا ارتکاب کرتے رہتے ہیں۔ حد تو یہ ہوگئی کہ حالیہ ایران + طاغوت جنگ میں بھی ہمارا یہ تعصب مخفی نہ رہ سکا۔ نام نہاد اللہ والوں نے (ایران پر) اُف کیسے کیسے تبصرے کیے ہیں، پتہ چلا کہ ہم اب تک خاموش رہنے کی حکمت سے بھی نابلد ہیں۔ بھیونڈی کے (مرحوم) عبدالقیوم نازاں صحیح کہہ گئے ہیں:

تعصّبات کے بت آج بھی سلامت ہیں
جو بس چلے تو ہر اک دل کو سومنات کہوں

آپ نامساعد حالات کے باوجود اپنا بے مثل جریدہ شائع کر رہے ہیں، آپ کے حوصلے اور ہمت کی داد۔ اللہ آپ کا حامی و مددگار رہے۔ آمین!

ندیم صدیقی (سینئر جرنلسٹ وشاعر۔ممبئی)
Mobile: 9323786610

ادب کی ترقی ٹکراؤ سے نہیں... صبر کی ضرورت

□... مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکیڈمی کی تاریخ نہایت شاندار رہی ہے، لیکن گزشتہ دو دہائیوں کا عرصہ اس ادارے کے لیے کسی تاریک دور سے کم نہیں تھا۔ انتظامی بے حسی اور حکومتی غفلت کی وجہ سے اردو ادب کی دھار جیسے تھم سی گئی تھی۔ ادیبوں کے قلم تو چلتے رہے، لیکن مالی امداد اور اکیڈمی کی حوصلہ افزائی کے فقدان میں بے شمار اہم تخلیقات اشاعت کی راہ دیکھتی رہ گئیں۔ انعامات کا سلسلہ رکنے سے قلم کاروں کا حوصلہ ٹوٹا، جو کسی بھی زندہ زبان کے لیے ایک افسوسناک صورت حال تھی۔ سال 2025 اردو ادب کے لیے ایک نئی امید لے کر آیا۔ مہا وکاس آگھاڑی حکومت نے اقلیتوں اور بالخصوص اردو زبان کے تئیں اپنی وابستگی کا ثبوت دیتے ہوئے اکیڈمی کے 50 سال مکمل ہونے پر ایک خطیر رقم مختص کی۔ اکیڈمی کے نئے چیئرمین کا تقرر اس بات کا ثبوت ہے کہ حکومت نظام کو ازسرِ نو زندہ کرنے کے لیے سنجیدہ ہے۔ انتظامی سطح پر بھی انقلابی تبدیلی کا منصوبہ بنایا گیا ہے، جس کے تحت پوری ریاست سے 12 اراکین کے تقرر کی تجویز ہے، جس کا جی آر بھی سرکار کی جانب سے نکال دیا گیا ہے. جب حکومت خود مالی امداد دینے اور تنظیمی ڈھانچے کو مضبوط کرنے کی سمت میں پیش رفت کر رہی ہے، تو کچھ تنظیموں کی جانب سے اراکین کے تقرر کے مطالبے کو لے کر دباؤ ڈالنا یا تحریک کی وارننگ دینا سمجھ سے بالاتر ہے۔ ممبئی کی کسی تنظیم کی جانب سے اکیڈمی کے کاموں میں مبینہ طور پر رکاوٹ ڈالنے کی کوشش نہ صرف گمرہی ہے بلکہ بھاری نقصان بھی ثابت ہوسکتی ہے۔ حکومت اپنے طے شدہ معیار کے مطابق کام کر رہی ہے۔ جب قیادت اور بجٹ طے ہو چکا ہے، تو اراکین کا تقرر بھی ایک انتظامی عمل کے تحت مکمل ہوگا۔ ایسے وقت میں ادیبوں کا گروہ بنا کر حکومت پر دباؤ ڈالنا یا انتظامی کاموں میں روڑے اٹکانا اس فائدے کو بھی خطرے میں ڈال سکتا ہے جو مستقبل میں ملنے والا ہے۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ جس وقت سے حکومت نے اکیڈمی کی طرف توجہ دینی شروع کی ہے، ریاست کے سیاسی اور ذاتی حالات کافی چیلنجنگ رہے

ہیں۔ مانک راؤ کوکاٹے سے وزارت کا قلمدان چھین لیا جانا اور پھر اجیت پوار جیسے قدآور لیڈر کا ایک حادثے میں انتقال ہونا، حکومت کے لیے بڑے جھٹکے ہیں۔ ایسی مشکل صورت حال میں انتظامیہ کو نظام سنبھالنے کے لیے وقت دینا لازمی ہے۔ اردو کے خیرخواہوں اور ادیبوں کو سمجھنا ہوگا کہ جلد بازی اور غیرضروری مخالفت کہیں اردو کے مستقبل کا نقصان نہ کر دے۔ اگر آج حکومت کے کاموں میں رکاوٹ پیدا کی گئی، تو ممکن ہے کہ حکومت کی توجہ اس اہم کام سے ہٹ جائے۔ مناسب یہی ہے کہ حکومت کو اپنا کام کرنے دیا جائے۔ ادب کی ترقی ٹکراؤ سے نہیں بلکہ اشتراک سے ممکن ہے۔ اردو کی بھلائی اسی میں ہے کہ ہم صبر رکھیں اور انتظامیہ کو اپنی پالیسی کے مطابق اکیڈمی کی تشکیلِ نو کرنے دیں۔

وسیم رضا خان (جرنلسٹ)
ہندی دینک نَو بھارت (ناسک ایڈیشن)
مالیگاؤں، ناسک (مہاراشٹر)۔موبائل: 9370170870

❑ ... مدھیہ پردیش کے شہر برہان پور سے آپ کی بخوبی واقفیت ہوگی۔ ماضی قریب کے شاہ باجنؒ، شیخ علی متقی اور عبدالرحیم خان خاناں جیسے جیّد شعرا و ادبا نے کسی زمانے میں اس شہر میں شعروادب کی قلمیں لگائی تھیں۔ شعروادب کا وہ پودا اس دور تک پہنچتے پہنچتے اب ایک تناور درخت بن چکا ہے۔ جہاں سے رسائل وجرائد میں نثری اور شعری کاوشیں منظرعام پر آتی رہتی ہیں۔

فاضلی اردو لٹریری سوسائٹی ایسے ہی خادمین کی ایک جماعت ہے جو کتابوں کی اشاعت کی اپنی سی کوشش کرتی ہے۔ اس مرتبہ برہان پور کے خوش فکر شاعر حضرت اختر آصف برہان پوری کی سخنوری اور حالاتِ زندگی پر بعنوان 'اختر آصف حیات و خدمات' ایک کتاب شائع کی گئی ہے جس میں متعدد نثر نگار، اسکالرز کے پُرمغز مضامین شامل ہیں۔

آپ کا پرچہ اردو قرأت و مطالعہ کے فقدان کے اس مشکل دور میں بہتر طریقے سے خدمات انجام دے رہا ہے۔ اس کے لیے مبارک باد۔ بہرکیف کتابوں کے دو نسخے برائے تبصرہ آپ کی خدمت میں حاضر ہیں۔

ڈاکٹر عارف انصاری
برہان پور (مدھیہ پردیش)۔موبائل: 9993994141

فرمانِ الٰہی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

... اپنے ربّ کی کِن کِن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے

ترجمہ:

نہایت مہربان (اللہ نے) ○ اِس قرآن کی تعلیم دی ہے ○ اُسی نے انسان کو پیدا کیا○ اور اسے بولنا سکھایا○ سورج اور چاند ایک حساب کے پابند ہیں ○ اور تارے اور درخت سب سجدہ ریز ہیں ○ آسمان کو اُس نے بلند کیا اور میزان قائم کردی ○ اُس کا تقاضا یہ ہے کہ تم میزان میں خلل نہ ڈالو○ انصاف کے ساتھ ٹھیک ٹھیک تولو اور ترازو میں ڈنڈی نہ مارو○ زمین کو اُس نے سب مخلوقات کے لیے بنایا○ اِس میں ہر طرح کے بکثرت لذیذ پھل ہیں ○ کھجور کے درخت ہیں جن کے پھل غلافوں میں لپٹے ہوئے ہیں ○ طرح طرح کے غلّے ہیں جن میں بھُوسا بھی ہوتا ہے اور دانا بھی ○ پس اے جنّ و اِنس، تم اپنے ربّ کی کِن کِن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے ○

[الرحمٰن: آیات ۱ تا ۱۳]

ترجمانی: علّامہ سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ

منجانب ——— ایک خیرخواہ

بلا تبصرہ

بہار کی بہار[1]

از: علامہ عبدالماجد دریابادیؒ

مارچ 1977 کا ذکر ہے کہ دارالعلوم ندوہ کی شہرت جلسہ دستار بندی[2] کے موقع پر انگریزی ہائی اسکول کے ایک نویں درجہ کے طالب علم کو اس کے والد ماجد کے ہمراہ کھینچ کر لکھنؤ لائی، کانوں کو اشتیاق تھا، دو تقریروں کے سننے کا اور آنکھوں کو تمنا تھی دو چیزوں کی زیارت کی۔ اللہ نے دونوں شوق پورے کرائے۔ پہلی بار تقریر سننی نصیب ہوگئی مولانا شبلی کی، اور زیارت ہوئی ان کے چہرے کی۔ دوسرے نمبر پر آرزو تھی ایک ندوی طالب علم کے دیکھنے اور سننے کی، جس کے مضامین استاد کے رنگ میں ڈوبے ہوئے، انہیں کے سانچے میں ڈھلے ہوئے، الندوہ میں نکل رہے تھے۔ جلسہ گاہ (رفاہ عام متصل سٹی اسٹیشن) میں پہنچ کر یہ دیکھنے میں آیا کہ ایک جواں عمر، خوش لباس طالب علم ہے، چہرہ پر خوش نما چھوٹی سی داڑھی، عینک، سر پر مدنی وضع کی مندیل، بشرہ سے ذہانت ٹپکتی ہوئی۔ سب کی نظروں کا مرکز و مرجع ہاتھوں ہاتھ لیا جارہا تھا۔ دستار بندی ہوئی یا صاحب کی لائی ہوئی اور پھیلائی ہوئی اصطلاحوں میں یوں کہیے کہ کانووکیشن ایڈریس پڑھا گیا اور ڈگریاں تقسیم ہوئیں اور اس ندوی نوجوان کی مفصل تقریر اردو میں ہوئی اور پھر ایک فرمائشی عنوان پر برجستہ تقریر عربی میں بھی۔ آنے والے اسکولی طالب علم کی دونوں تمنائیں — ہائے لڑکپن کی نیم معصومانہ مسرتوں کا نشہ اب کوئی کہاں سے لائے۔ جی بھر کر پوری ہوئیں۔ 1907 کا اسکولی طالب علم وہی تھا، جو آج ان سطور کا راقم ہے، اور فاضل ندوی نوجوان وہ تھا جو بحمدللہ اردو میں سیرت نبوی کے ضخیم دفتر تیار کر چکا ہے، اور جسے دنیا اب 'مولانا' اور 'علامہ' کے القاب کے اضافہ کے ساتھ سیّد سلیمان ندوی کہہ کر پکارتی ہے۔

اودھ کی سرزمین پر بہار کی محبت وعظمت کا تخم پڑا، اور وہ دن ہے اور آج، کہ تخم نے جڑ پکڑی، پودا بنا برگ و بار پیدا کیے، اور آج ایک درخت ہی نہیں، پورا باغ کا باغ تیار۔ 33 برس کی مدت کچھ تھوڑی ہوئی! قرن کا قرن گزر گیا۔ خدا جانے کتنی آندھیاں، کتنے طوفان اتنی مدت میں آئے اور کیسے کیسے چمن لٹ کر رہے، لیکن بہار کی خوش گوار یاد کی بہار آج بھی قائم، بلکہ اس میں دم بدم اضافہ و ترقی۔

میں بے حد شرمیلا اور بدہمت۔ الندوہ کے مقالہ نگار کی علمی عظمت کا رعب دل پر طاری۔ ملنے کی جرأت اس وقت نہ ہوئی۔ کئی سال بعد جب لکھنؤ کے کیننگ کالج میں بی اے کے پہلے سال کا طالب علم تھا، غالباً آخر 1911 تھا، اور مولانا شبلی مرحوم کی الکلام پر ملحدانہ تنقید کے سلسلہ میں 'نام' حاصل کر چکا تھا۔ جب جا کر تعارف کی نوبت آئی۔ اور نیازمندی کے تعلقات رفتہ رفتہ اتنے بڑھے کہ دوستی کے ڈانڈے عزیز داری سے جا ملے اور اب سیّد صاحب میں اور اپنے قریب کے عزیزوں میں گویا کوئی فرق ہی معلوم نہیں ہوتا۔

مقامی خصوصیات، تمدن، معاشرت، ہر صوبہ کے الگ الگ ہوتے ہیں۔ پنجاب، بمبئی، سی پی، سب کہیں کا رنگ اودھ سے جداگانہ ہے۔ یہاں تک کہ خود یوپی کے شمالی مغربی اور جنوبی علاقے طرز معاشرت میں اودھ سے بالکل الگ تھلگ

---

[1] رسالہ ندیم (گیا) بہار نمبر، 1940

[2] جلسہ دستار بندی کی اصطلاح اب غیر مفہوم ہوچکی ہے۔ پرانی درس گاہوں میں دستور یہ تھا کہ طلبا کو تحصیل علم سے فارغ ہونے پر ایک جلسہ عام میں سند دی جاتی تھی اور سر پر فضیلت کی پگڑی باندھی جاتی تھی۔

معلوم ہوتے ہیں لیکن یہ خصوصیت بہار ہی میں دیکھنے میں آئی کہ وہاں کا رنگ ڈھنگ بالکل اودھ کا، اجنبیت کم سے کم مجھے تو کسی موقع پر محسوس نہیں ہوئی۔ پٹنہ کا تمدن لکھنؤ کے تمدن کا مثنیٰ۔ جس بہاری سے ملا معلوم ہوا اپنے ہی جوار کے کسی شخص سے ملاقات ہو رہی ہے۔

سیّد صاحب کے سلسلہ میں ان کے متعدد عزیزوں، ہم وطنوں سے ملاقاتیں ہوتی گئیں۔ سیّد نجیب اشرف ندوی اب ماشاءاللہ ایم اے ہیں اور بمبئی کی طرف کسی کالج کے پروفیسر ہیں۔ میری نظر میں ان کی وہی لڑکپن کی بھولی صورت پھر رہی ہے، جب وہ ندوہ میں پڑھ رہے تھے اور ہنستے مسکراتے ہوئے نیم معصومانہ چہرہ کے ساتھ، نومشق بچوں میں ایک ہونہار مقرر تھے۔ مولوی ابوظفر صاحب ندوی، مولوی سیّد ہاشم ندوی (دائرۃ المعارف والے)، مولوی سیّد محمد ندوی (شاگرد مولانا عبدالرحمٰن نگرامی مرحوم) اور مولوی سیّد عبدالحکیم صاحب دیسنوی، وغیرہم ان میں سے بعض کی ملاقاتیں خود مستقل داستانیں ہیں۔

بہار و اودھ کے تعلقات کی تاریخ اس سے بھی قدیم تر ہے۔ یہ ذکر تو میری اور سیّد صاحب کی ملاقات کا تھا۔ لیکن سیّد صاحب ہی کے ایک بزرگ ہم نام، ابھی کل تک زندہ وسلامت مولانا قاری سیّد شاہ سلیمان صاحب پھلواروی تھے۔ ۳۰—۳۵ سال اُدھر علی گڑھ کانفرنس کا ہر اجلاس ان کے دَم سے آباد، تو ندوہ کا ہر جلسہ ان کے وجود سے شاد اور میلادی بیان تو گویا ان کا حصہ تھا۔ ان کا ذکر خیر اپنے بالکل بچپن میں اپنے بزرگوں سے بارہا سننے میں آیا تھا، اور اپنے والد ماجد کے اُن سے مخلصانہ تعلقات 1910 تا 1912 اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ شاہ صاحب کی طالب علمی کا ایک زمانہ لکھنؤ فرنگی محل میں گزرا تھا اور ہمارا خاندان بھی اپنے قرب تعلقات کی بنا پر گویا فرنگی محل کا ایک جزو تھا۔ شاہ صاحب نے بعض کتابیں ہمارے بزرگوں سے پڑھی تھیں اور اسی تعلق سے کبھی کبھی دریاباد میں تشریف لاتے تھے، مگر میری یاد سے پہلے۔ اس کا تذکرہ خود موصوف نے اپنی زبان سے فرمایا، جب بہت مدت کے بعد غالباً 1931 میں مجھے ذاتی طور پر شرف نیاز حاصل ہوا۔ ان کی بزرگانہ شفقت اور کرم فرمائی بھولنے کی چیز نہیں۔ 1927 میں جب پھلواری تھوڑی دیر کے لیے حاضری کا اتفاق ہوا تو خود شاہ صاحب اور ان کے ایک بھائی صاحب (غالباً مولوی علی حافظ نام تھا) اور صاحبزادے شاہ حسین میاں صاحب نے میرے لیے پردیس کو وطن بنا دیا۔ دوسرے صاحبزادے شاہ جعفر میاں اور نواسہ مولوی شاہ عزالدین سلمہ کی کرم فرمائیاں عین اپنی ان کی روایات خاندان کے مطابق ہیں۔

لکھنؤ میں دارالعلوم ندوہ ایک بڑا مرکز بہاری نوجوانوں کا ہے۔ اپنی کالجی طالب علمی کے زمانے میں بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ بہار کا آدھا صوبہ کھینچ کر لکھنؤ آ گیا ہے اور ندوہ کا دارالاقامہ پٹنہ ہی کا کوئی محلہ ہے۔ خدا جانے کتنوں سے ملاقات اس سلسلہ ہوگئی۔ مولوی حاجی معین الدین (صاحب خلفاء راشدین) اور مولوی مسعود عالم (ایڈیٹر 'ایضاء' عربی) کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ مولوی ابوالحسنات بے چارہ کی یادگار شاید چند مضامین سے زائد نہ ہوں، بڑے ہونہار تھے۔ عین شباب میں وفات پا گئے۔ جلسوں میں نظم بالکل مولانا شبلی کے لہجہ میں پڑھتے تھے۔ مولوی احمداللہ ندوی، مولوی عبدالقدوس ہاشمی ندوی (اب یہ سب حیدرآباد میں ہیں) سے بھی تعارف اسی زمانہ میں ہوا۔ مولوی سیّد ریاست علی ندوی آج ماشاءاللہ دوسروں کے 'ندیم' و رہبر ہیں۔ ان کا وہ زمانہ یاد ہے، غالباً 1920 میں جب وہ بالکل سبزہ آغاز تھے اور مولانا عبدالرحمٰن نگرامی مرحوم کے عزیز مخصوص شاگردوں میں تھے۔ مولوی عبدالغفور صاحب شرر کا نام لیجیے بھول ہی چلا تھا۔ دفتر ندوہ کے بڑے پرانے سرگرم کارکن تھے اور اب تو شاید نائب ناظم وہی ہیں۔ ایک زمانہ میں واقعی شرر ہی تھے۔

دارالعلوم کے بورڈنگ کے مقابل کیننگ کالج ہوسٹل تھا (جو اَب یونیورسٹی ہوسٹل ہے) اس میں 1911 میں ایک سال قائم رہا۔ یہاں پٹنہ کے ایک نوجوان سیّد باقر حسن پہلے سے بورڈر تھے۔ بہار کے مشہور بیرسٹر سر سلطان کے چھوٹے بھائی۔ وجیہ وخوش رو، ہونہار وخوش خو علی گڑھ رہ کر آئے تھے۔ انگریزی تحریر وتقریر دونوں میں برق، مسلمانوں کے کام میں آگے آگے مجھ سے ایک سال آگے تھے۔ میں بی اے کے پہلے سال میں تھا، وہ آخری سال میں، بے چارہ کالج چھوڑتے ہی بیمار پڑے

اور کچھ ہی روز بعد دق میں انتقال کر گئے۔سنی طلبا سے ایسے شیرو شکر رہے کہ ان کے شیعہ ہونے کا پتہ بھی نہ چلا۔

سرعلی امام کے بھائی حسن امام، اور والد ماجد نواب امداد امام صاحب اثر۔نواب نصیر حسین خاں خیال اور اس وقت کے مشہور بیرسٹر مظہرالحق کو راجہ صاحب محمود آباد کے ہاں اور قومی جلسوں میں قریب سے دیکھنے کا اتفاق بارہا ہوا۔لیکن بجز نواب خیال کے اور کسی سے ذاتی تعارف کی نوبت نہ آئی۔ پٹنہ ہی کے رہنے والے ایک ڈاکٹرمحمد وارث اڈنبرا یونیورسٹی کے ایم ڈی، لکھنؤ میں پریکٹس کرتے تھے۔حکیم مہدی کے مقبرہ کے مقابل جگت نرائن روڈ پر۔ 1909 تھا کہ اپنی مریض آنکھوں کا معائنہ کرانے گیا، بڑی توجہ اور شفقت سے دیکھا۔ میں طالب علم، بھلا فیس کیا پیش کر سکتا تھا، ان کی توجہ ہی بہت غنیمت معلوم ہوئی۔ ملاقاتوں کا سلسلہ قائم ہو گیا۔ اکثر ان کے ہاں آتا جاتا رہتا۔کام تو بے چارہ کا یوں ہی سا چلتا۔ البتہ اپنے فن سے متعلق پڑھے لکھے بہت تھے پہلی جنگ یوروپ کے زمانے میں کہیں سول سرجن ہوکر چلے گئے۔ اس کے بعد صرف ایک بار سرسری ملاقات ہوئی تھی۔ جہاں کہیں ہوں اللہ خوش رکھے۔

خلافت وترک موالات کی تحریک نے دور دور کے مسلمانوں کو یکجا کر دیا تھا۔ بہار واودھ کا تو پڑوس ہی تھا۔ میں تحریک میں شریک اس وقت ہوا، جب خود تحریک ختم ہو رہی تھی، محمد علی کی ذات اس وقت بھی بجائے خود ایک مرکز و مرجع تھی، میں تو خیر عاشقوں میں تھا، باقی اور بھی خدا معلوم کتنے اس شمع کے پروانے تھے۔ دہلی بار بار میری آمد ورفت رہتی۔ یہ ذکر 1924 اور اس کے بعد کا ہے اور دفتر ہمدرد کا مرپڈ میں سب کہیں کے مسلمان اکٹھے ہوتے رہتے تھے۔ مولوی محمد شفیع داؤدی، مولوی عبدالغنی، پروفیسر عبدالباری (جواب شاید 'باری جی' کہلاتے ہیں) مولوی سیّدحسن آرزو وغیرہم سے اس سلسلہ میں بارہا ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ حضراتِ بہار کی سادگی اور اخلاص مندی سے دل خاص طور پر متاثر رہا۔ مولوی شفیع داؤدی اور مولوی عبدالغنی کو دیکھ کر حیرت ہوئی تھی کہ اسمبلی اور کونسل کے ممبر ہوکر نماز کے پورے پابند ہیں۔ لباس سادہ رکھتے ہیں۔ بازار میں پیدل چلتے پھرتے اور اپنے ہاتھ سے سودا سُلف لے آتے ہیں، بھلا ہمارے ہاں کے ارکان کونسل مسجد کی حاضری اور موٹر چھوڑ کر پیدل چلنا کیا جانیں؟ مولانا سجاد صاحب نائب امیر شریعت بہار کو پہلی بار مولانا عبدالباری فرنگی محلی مرحوم کے مکان پر دیکھا پھر خلافت وغیرہ کے جلسوں میں متعدد بار لکھنؤ میں ملاقات رہی۔ دل ان کے علم وتدین دونوں کا قائل رہا۔ اور آگے چل کر جب ان سے اور مولوی محمد شفیع صاحب داؤدی سے جو شدید جنگ برپا ہو گئی تھی تو دل اس سے برابر دکھتا ہی رہا— دنیا میں بارہا ایسا ہوا ہے کہ مخاصمہ کے دونوں فریق اپنی اپنی جگہ بے قصور ہی نکلے۔

ایک مرکز اہل بہار کا علی گڑھ بھی ہے۔ یونیورسٹی کورٹ کی ممبری کے سلسلہ میں وہاں کئی سال سے آمد ورفت قائم ہے۔ مولانا سلیمان اشرف مرحوم اب بہاری ہو گئے تھے، لیکن ان کا خاندان تھا ہمارے اودھ ہی کے قصبہ کچھوچھے کا۔ ان کی زبردست شخصیت بعض عجیب خصوصیات کی مالک تھی اور پروفیسر ابوبکر محمد حلیم صاحب ایم اے جو عرصہ سے پرووائس چانسلر ہیں، اسم بامسمیٰ پیکرحلم وخوش خلقی ہیں۔ مرزا اختر حسین صاحب رجسٹرار پٹنہ یونیورسٹی، مسلم یونیورسٹی کورٹ کے ممبر ہیں۔ان سے بارہا نیاز حاصل ہوتا رہا۔

سچ بھی ایک ذریعہ اہل بہار کی توجہ منعطف کرنے کا تھا بلکہ دکن کے بعد سچ کی سب سے زیادہ قدرافزائی علاقہ بہار ہی نے کی۔ چھپرا کے وکیل، محمد اسمٰعیل صاحب، ترہٹ ضلع گیا کے قاضی احمدحسین صاحب، رانچی کے ہیڈ ماسٹر الطاف کریم صاحب اور پٹنہ کے مولوی منظرعلی ندوی مرحوم (المبشر والے) اسی سلسلہ سے مہربان ہوئے۔مولوی منظر مرحوم تو خدا کے گھر سدھارے باقی حضرات کی خیریت ادھر ایک عرصہ سے دریافت نہیں ہوئی۔ الطاف کریم صاحب دریاباد کو بھی سرفراز کر چکے ہیں۔ [جاری]

کتاب: انشائے ماجد یا لطائف ادب
مصنف: عبدالماجد دریابادیؒ، اشاعت: 2000ء
بہ شکریہ: ادارہ علم وفن، کراچی-75210 (پاکستان)

□□□

مولانا ابواللیث اصلاحی ندویؒ

کی علمی وفکری تصانیف

• تشکیل جماعت اسلامی ہند- کیوں اور کیسے	115.00
• جماعت اسلامی کا مقصد اور طریقۂ کار	36.00
• جماعت اسلامی ہند- حقائق اور الزامات	15.00
• حالاتِ حاضرہ اور ہماری ذمے داریاں	14.00
• داعی اور دعوت	12.00
• مغرب میں اسلام کی دعوت	12.00
• ملک وملت کے مسائل اور مسلمانوں کی ذمہ داریاں	08.00
• نشہ بندی اور اسلام	12.00
• ہندوستان کا مستقبل اور جماعت اسلامی کی دعوت	10.00
• امت مسلمہ اور جدید تہذیبی مسائل	50.00
• مسلمانان ہند آزادی کے بعد	186.00
• تحریک اسلامی کی اساس	16.00

MMI PUBLISHERS مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز

D-307, Dawat Nagar, Abul Fazl Enclave, Jamia Nagar, New Delhi-110025

mmipublishers@gmail.com www.mmipublishers.net **7290092403**

Sub Depot: **Hyderabad :** 9491874087 | **Mumbai :** 9699167700 | **Goa :** 9987196549 | **Bangalore :** 9036996740

غالب ثنائے خواجہ: ایک تاثر

از: ڈاکٹر شمس بدایونی ☆

مرزا غالب، اردو ادب کے اجتماعی شعور کا حصہ بن چکے ہیں۔ اردو کا شاید ہی ایسا کوئی قلم کار ہو، جس نے مرزا کی دہلیز کو بوسہ نہ دیا ہو اور اردو کا شاید ہی کوئی ایسا قاری ہو جس کو مرزا کا کوئی شعر یا لطیفہ یاد نہ ہو۔ اردو کے علاوہ دوسری زبانوں کے اہل قلم بھی مرزا کی شخصیت، فن اور ان کے کلام کے گرویدہ رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اردو شعرا میں سب سے زیادہ زباں زد مصرعے اور اشعار مرزا غالب کے ہیں، جو آج ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ ان کے خطوط کے بعض جملے بھی زبان زد ہو چکے ہیں۔ ہر چند کہ غالب کے مخالفین بھی ہر دور میں پائے گئے، لیکن وہ بھی غالب کی متنوع شخصیت، بدیع طرز فکر اور بوقلموں طرز زندگی سے ہی ان کی مخالفت کے لیے مواد حاصل کرتے رہے اور غالب کو ادب میں ایک نئی زندگی دینے کے محرک بنے۔ یوں غالب ایک 'دائم الجدت' شخصیت کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں اور ان کی مقبولیت میں ہر روز اضافہ ہو رہا ہے۔

غالب کی وفات (1869) سے آج تک ان کی حیات و فن، ان کے عہد اور معاصرین پر ہزار ہا کتابیں لکھی گئیں، لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ پیغمبر اسلام (ﷺ) اور اہل بیت خصوصاً حضرت علی (کرم اللہ وجہہ) سے بے پناہ عقیدت و احترام کا جذبہ رکھنے کے باوجود مرزا کی نعت گوئی کو کتاب کا عنوان نہیں بنایا جا سکا۔ اس کی چند اور وجوہ کے ساتھ ساتھ بڑی وجہ شاید یہ تھی کہ مرزا کی زندگی میں مذہب کا تصور برائے 'شعر گفتن خوب است' تک محدود تھا۔ وہ اپنے عہد کی نمائشی اور بے عمل زندگی کی علامت بن گئے تھے۔ وہ ساری زندگی مذہبی اعمال سے کنارہ کش رہے اور اپنی شاعری کے ذریعے مذہب کے بعض شعائر پر بھی انگشت نمائی کرتے رہے، جسے مرزا کی آزاد خیالی، اور تقلید رسوم سے ان کی بیزاری سمجھا اور سمجھایا گیا اور اسے ان کی شخصیت کے ایک حسن کی صورت میں دیکھا گیا۔ غالب صدی (1969) کے دوران غالب فہمی، غالب شناسی اور غالب باز آفرینی کا جو سلسلہ شروع ہوا اس میں میری محدود معلومات کے مطابق ان کی نعت گوئی پر ایک مقالہ ضرور قلم بند کیا گیا جو میرے ہم وطن پروفیسر ضیاء احمد (و:1973) کی کاوش قلم کا نتیجہ ہے۔ یہ بہ عنوان 'غالب کا نعتیہ کلام' پہلی بار مالک رام کی مرتبہ کتاب 'عیار غالب' (ناشر، علمی مجلس دہلی 1969) میں شامل ہوا، بعد میں متعدد جگہ نقل ہوا۔

پاکستان میں جنرل ضیاء الحق کا دور صدارت (1978 تا 1988) سیاسی طور پر کیسا بھی پُرآشوب رہا ہو، لیکن مذہبی اقدار کی حرمت و احترام اور نعت گوئی کے فروغ کا سبب یہ ضرور بنا۔ قدیم شعرا پیغمبر اسلام کی صورت و سراپا، میلاد، معراج، غزوات، روضۂ مبارک پر حاضری، فراق اور ان سے عقیدت و محبت ہی کو عام طور پر نعت کا موضوع اور عنوان بناتے رہے، لیکن جدید شعرا نے نعت کے موضوعات میں اضافہ کرتے ہوئے آپ کی شخصیت کے وہ پہلو جو عرفان ذات، عرفان کائنات اور عرفان خداوندی کا ذریعہ ہیں اور کائنات زندگی میں اخلاقی اوصاف اور عدل قائم کرنے کا ایک وسیلہ بن سکتے ہیں؛ ڈھونڈ نکالے اور ترجیحاً ان کو پیش کیا۔ یوں نعت میں ایک ندرت پیدا ہوئی اور پاکستان کے ادبی ماحول میں یہ مقبول اور پروان چڑھی۔

اسی دوران جدید شعرا کے نعتیہ مجموعوں کی اشاعت اور نعت پر مستقل رسالے مرتب کرنے کا سلسلہ شروع ہوا اور یہ سلسلہ دراز ہو کر نعتیہ صحافت کا ایک عنوان بن گیا۔ ڈاکٹر شہزاد احمد نے

☆ مضمون نگار سے رابطہ: موبائل نمبر 9837092245 (بریلی)

اپنی کتاب'اردو میں نعتیہ صحافت ایک جائزہ'(کراچی 2016) میں صرف نعت پر مشتمل تقریباً نصف درجن ماہناموں، چند روزناموں اور ڈیڑھ درجن کتابی سلسلوں اور اَن گنت نعت نمبروں کا تذکرہ کیا ہے۔ ان کی تحقیق کے مطابق نعت پر مشتمل پہلا ماہنامہ، کراچی سے شائع ہونے والا'نوائے نعت' ہے جس کا اجرا ادیب رائے پوری نے جنوری 1984 میں کیا تھا۔ کتابی سلسلوں کے تحت اولیت کا سہرا'ایوان نعت' لاہور (اجرا نومبر 1987) کو حاصل ہے۔

صبیح رحمانی (پیدائش 1965) نے اپریل 1995 میں اسی سلسلے کو دراز اور ایک معیاری صورت دیتے ہوئے شاعری کی ایک مظلوم موضوعی صنف پر مشتمل رسالہ'نعت رنگ' کے نام سے جاری کیا۔ یہ رسالہ کیفیت وکمیت ہر لحاظ سے منفرد تھا۔ اس نے بہت جلد ہند و پاک میں نعتیہ ادب پر لکھنے والوں کو اپنی طرف ملتفت کرلیا اور نعت پر علمی، تحقیقی، ادبی، تنقیدی و مذہبی مضامین کا انبار لگا دیا۔ اس طور اس نے نعت کہنے اور نعتیہ ادب کو پڑھنے والوں کے ذوق کی آبیاری کی اور یہ ان کے لیے رہنما خطوط مرتب کرنے کا بھی وسیلہ بنا۔

نعت رنگ کے اب تک (1995 تا 2020) 30 ضخیم شمارے شائع ہو چکے ہیں۔ ہند و پاک کے ادیبوں کو نعتیہ ادب کی طرف متوجہ کرنے، اس کا ایک علمی و ادبی معیار متعین کرنے، اس کی تحقیقی وتنقیدی بساط بچھانے اور اسے بغیر کسی علاقائی، مسلکی یا مشربی عصبیت کے جاری رکھنے کا جو کام تن تنہا صبیح رحمانی نے انجام دیا اس نے نعتیہ ادب پر لکھنے والوں کو ایک مرکز پر لا کر جمع کر دیا۔ بعد میں نعت ریسرچ سینٹر کا قیام، نعتیہ لائبریری کا قیام، نعتیہ ادب کی اشاعت کا مرکز، نعت ببلیو گرافی ان کی اسی سلسلے کی کوششیں ہیں جو بارآور ہو چکی ہیں۔

صبیح رحمانی کی ان خدمات کا اعتراف جامعاتی سطح پر ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کے متعدد مقالے لکھ کر کیا جا چکا ہے۔ میں یہاں صرف ان کی اس خدمت کا اعتراف واظہار کروں گا جو انہوں نے نعت کے حوالے سے غالب کے سلسلے میں کی ہے۔

انہوں نے'نعت رنگ' کے شمارہ نمبر 12، اکتوبر 2001 میں' گوشۂ غالب' مرتب کیا۔ یہ گوشہ تقریباً 131 صفحات کو محیط تھا۔ اس میں سات مضامین، 5 تضمینیں، غالب کی فارسی نعت کے دو منظوم اردو تراجم اور غالب کی زمینوں میں 13 شعرا کی نعتیں شامل کی گئی تھیں۔ پروفیسر ضیا احمد کے مقالے کے سوا باقی مقالات خاص اس گوشے کے لیے لکھوائے گئے تھے۔ اس طور اردو میں پہلی بار غالب کی نعتیہ شاعری کو موضوع گفتگو بنایا گیا تھا۔ یہ گوشہ پسند کیا گیا اور نعتیہ ادب میں ایک رندخرابات کو جگہ مل گئی۔ بعد میں اسی گوشے کے مواد میں حذف و اضافہ کر کے کتابی شکل میں باسم'غالب اور ثنائے خواجہ' پہلی بار 2009 میں نعت ریسرچ سینٹر کراچی نے شائع کیا۔ اس کا طبع دوم ادارہ یادگار غالب کراچی کے اشاعتی سلسلے کا حصہ بن کر منظر عام پر آیا۔ اس کے بعد اس کا تیسرا ایڈیشن مزید اضافوں کے ساتھ شائع ہوا۔

پہلے ایڈیشن میں جناب صبیح رحمانی کے ابتدائیے کے علاوہ دو تضمینیں اور دس مضامین شامل ہیں۔ ان مضامین کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ مرزا نے اردو میں نعت کا صرف ایک شعر کہا:

اس کی امت میں ہوں میں، میرے رہیں کیوں کام بند
واسطے جس شہ کے غالب، گنبدِ بے در کھلا

باقی جو اردو اشعار نعت کے حوالے سے غالب کے پیش کیے جاتے ہیں ان کا مضمون اور مرجع کچھ اور ہے، نعت سے ان کی مطابقت اتفاقی ہے۔ غالب نے نعت کے مقصد سے وہ اشعار نہیں کہے۔ البتہ فارسی میں انہوں نے تین مثنویات، ڈھائی قصائد، ایک قطعہ، غزل کی ہیئت میں نو شعر کی ایک نعت اور قدسی کی نعت پر نو بند کا خمسہ یادگار چھوڑا ہے، جن کا کتاب میں شامل مضامین میں تجزیہ وتعارف پیش کیا گیا ہے۔

(مولانا) حالی نے یادگار غالب میں لکھا ہے:

''انہوں نے تمام عبادات اور فرائض و واجبات میں سے صرف دو چیزیں لے لی تھیں، ایک توحید وجودی، دوسرے نبی اور اہل بیت نبی کی محبت؛ اور اسی کو وہ وسیلہ نجات سمجھتے تھے۔''

اس پہلو سے بھی غالب کے خطوط اور شاعری کے حوالے سے ان کے دل میں راسخ الفت اہل بیت اور نبی الرحمہ کی محبت و عظمت کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مختصر یہ کہ ان مضامین سے غالب کی شاعری کی ایک نئی جہت اور اس کے آداب سے باخبری ملتی ہے۔ [باقی صفحہ:24]

ہم برِعظیم کے باسی ہیں یا برِصغیر کے؟

از: احمد حاطب صدیقی (ابونثر)

راولپنڈی سے راجا محمد یوسف صاحب کا ایک مراسلہ موصول ہوا ہے۔ بعد دعا و سلام لکھتے ہیں:

''اپنے شاگردوں کے لیے ایک مضمون کا انگریزی سے اُردو میں ترجمہ کر رہا تھا۔ ایک جگہ آ کر اُلجھ گیا۔ الجھن یہ ہے کہ اُردو میں Subcontinent کا ترجمہ 'برصغیر' بھی کیا جاتا ہے اور 'برِعظیم' بھی۔ رہنمائی فرمائیے کہ دونوں میں سے کون سا ترجمہ درست ہے؟''

صاحب! سب سے پہلے تو ہماری طرف سے ہدیۂ ستائش قبول فرمائیے۔ اگر ہمارے تمام اساتذہ اپنے شاگردوں کے لیے عصری علوم کا اُردو میں ترجمہ کرنے کی سعی فرمانے لگیں تو ہمارے طالب علموں کا علمی معیار یقیناً بہتر ہوجائے گا۔ آپ کی مساعی قابلِ تحسین ہیں۔

برادرِمن! اگر آپ صحیح اور غلط یا درست و نادرست کا سوال کریں گے تو ہم کہنے پر مجبور ہوں گے کہ Subcontinent کا ترجمہ 'برِعظیم' ہی درست ہے، 'برصغیر' درست نہیں۔ ماضی میں مشرقی و مغربی پاکستان اور بھارت کے علاقوں کو ملا کر جو خطہ بنتا تھا، اُس کے لیے انگریزی اصطلاح استعمال کی جاتی تھی 'Indo-Pak Subcontinent' جس کا ترجمہ اُردو زبان کی اکثر تحاریر میں اُسی زمانے سے 'برصغیر پاک و ہند' کیا جاتا رہا ہے۔ بعد کو بھی 'برصغیر' ہی کہا جاتا اور لکھا جاتا رہا۔ مگر کیا کیجیے کہ بالکل غلط کیا جاتا رہا۔

ڈاکٹر رؤف پاریکھ نے اپنی کتاب 'صحتِ زبان' (شائع کردہ: ادارۂ فروغِ قومی زبان) میں دونوں تراجم کے مفہوم میں پائے جانے والے فرق کو تفصیل سے سمجھایا ہے۔ ڈاکٹر پاریکھ کے سمجھانے پر ہماری سمجھ میں بھی آ گیا، ورنہ پہلے ہم بھی 'برصغیر' ہی لکھا کرتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کی گراں قدر تحریر سے استفادہ کرتے ہوئے آپ کے سوال کا تفصیلی جواب دینے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اُمید تو ہے کہ ہماری یہ کوشش کامیاب رہے گی، اِن شاءاللہ۔

دیکھیے Continent کے لیے اُردو میں 'براعظم' کی اصطلاح رائج ہے۔ 'بر' یہاں خشک خطۂ زمین کے معنوں میں ہے جو بحر کا متضاد ہے۔ اگر دنیا کے ہر خشک و تر کا ساتھ ذکر کرنا ہو تو ہم 'بحر و بر' کہہ کر سب کو لپیٹ لیتے ہیں۔ جیسا کہ بالِ جبریل میں اقبالؔ فرماتے ہیں:

یہی آدم ہے سلطاں بحر و بر کا
کہوں کیا ماجرا اس بے بصر کا

قرآن مجید میں بھی کئی مقامات پر پورے کرۂ ارضی کے لیے ''اَلْبَرِّ وَالْبَحْرِ'' کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے۔ مثلاً سورۃ بنی اسرائیل کی آیت نمبر 70 میں اللہ تعالیٰ نے انسان پر اپنے احسان کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

''ہم نے بنی آدم کو بڑی عزت دی اور انہیں خشکی اور تری کی سواریاں عطا کیں، انہیں پاکیزہ چیزوں کا رزق دیا اور ان کو اپنی بہت سی مخلوقات پر واضح فضیلت بخشی''۔

اسی طرح سورۃ الروم کی آیت نمبر 41 میں فرمایا گیا:

''انسانوں کے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے خشکی اور تری میں فساد پھیل گیا''۔

اقبالؔ کے محولہ بالا شعر کے دونوں مصرعوں میں ان دونوں آیات کے مفاہیم کی جھلک ملتی ہے۔

سب جانتے ہیں کہ 'اعظم' کے معنی ہیں 'بہت بڑا'۔ یہ صیغۂ تفضیل ہے۔ کسی چیز کو باقی سب چیزوں پر بڑائی میں فضیلت

دینا مقصود ہو اُس کے ساتھ 'اعظم' لگا دیتے ہیں۔ جیسے عرشِ اعظم یعنی سب سے بڑا تخت جو اللہ تعالیٰ کا تخت ہے۔ جیسے اسمِ اعظم یعنی اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا نام۔ احادیث میں مختلف کلمات کی اسمِ اعظم کے طور پر نشان دہی کی گئی ہے۔ جیسے نیّرِ اعظم یعنی سب سے بڑا ستارہ، جو عموماً سورج کو کہا جاتا ہے (نیّر کے لغوی معنی ہیں نور بکھیرنے والا) اور جیسے قائداعظم یعنی سب سے بڑا لیڈر۔ بلاشبہ قائداعظم محمد علی جناحؒ اپنے دور میں برِعظیم کے مسلمانوں کے سب سے بڑے قائد تھے۔ چوں کہ ہماری زمین پر بھی سمندروں کے ساتھ خشکی کے سات بڑے بڑے خطے پائے جاتے ہیں، چناں چہ ان خطوں کو بھی ہم 'براعظم' کہتے ہیں۔ مثلاً براعظم یورپ، براعظم افریقا اور براعظم ایشیا وغیرہ۔

پاکستان، بھارت اور موجودہ بنگلا دیش کو دنیا کے نقشے پر دیکھیے تو سب کو ملا کر ایک چھوٹا موٹا براعظم ہی بنتا ہوا نظر آتا ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ خشکی کا یہ عظیم خطہ کوئی الگ خطہ نہیں بلکہ براعظم ایشیا کا حصہ ہے۔ اس وجہ سے اِسے براعظم کہنا تو مناسب نہیں ہے، ہاں برِعظیم کہہ سکتے ہیں اور ہم برِعظیم کے باسی کسی بھی براعظم سے خم ٹھونک کر کہہ سکتے ہیں کہ ''تری داستاں بھی عظیم ہے، مری داستاں بھی عظیم ہے''۔

رہا لفظ 'صغیر' تو عربی، فارسی، اُردو تینوں لغات میں 'صغیر' کا مطلب چھوٹا، نابالغ، کم تر، حقیر اور ادنیٰ ہی ملے گا۔ صغیر کی جمع 'صغار' ہے۔ چھوٹے گناہ کو 'گناہِ صغیرہ' کہا جاتا ہے۔ صغیرہ کی جمع 'صغائر' ہے۔ کم عمری یا چھوٹی عمر کو ہم 'صغرسنی' کہتے ہیں۔ سب سے چھوٹے کو 'اصغر' کہا جاتا ہے۔ اصغر کی جمع 'اصاغر' ہے۔ سب سے چھوٹی بیٹی کا نام 'صُغریٰ' رکھا جاتا ہے۔ یہ اصغر کی مؤنث ہے۔ مگر چوں کہ سیدہ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کی پوتی اور سیدنا حسین رضی اللہ عنہ کی بیٹی فاطمہ کا لقب صغریٰ تھا (فاطمۃ الصغریٰ۔ یعنی چھوٹی فاطمہؓ) چناں چہ مسلمان بڑی، چھوٹی یا منجھلی کسی بھی بیٹی کا نام صغریٰ رکھ لیتے ہیں۔ کشورِ پنجاب کے لوگ اپنی بیٹی کا نام 'صغریٰ' رکھتے ہیں تو شاید اُسے مزید مؤنث کرنے کی خاطر پیار سے 'صُغراں' کہہ کہہ کر پکارا کرتے ہیں۔

جب یہ طے ہو گیا کہ 'صغیر' چھوٹے اور حقیر کو کہتے ہیں تو اب آپ خود طے کر لیجیے کہ ہم 'برِعظیم' کے باسی ہیں یا 'برِصغیر' کے؟

ضمناً یہ بھی بتاتے چلیں کہ دنیا کے نقشے پر آپ کو 'مونا کو' نام کا ایک ملک نظر آئے گا، جس کا کُل رقبہ دو اعشاریہ صفر دو مربع کلومیٹر ہے۔ خشکی کے اس مختصر سے اور چھوٹے سے خطے کے باشندے اگر چاہیں تو اپنے ملک کو 'برِصغیر' کہہ لیا کریں، ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا 'اعظم' اسمِ تفضیل ہے۔ مطلب یہ کہ عظیم چیزوں میں سے کوئی چیز سب سے زیادہ عظیم ہو جائے تو اُسے 'اعظم' کہتے ہیں۔ یعنی اعظم دراصل عظیم کی تفضیل ہے، صغیر کی نہیں۔ لہٰذا براعظم سے چھوٹا خطہ 'برِعظیم' ہی کہا جا سکتا ہے۔ اور جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، سب سے چھوٹے کو اصغر کہا جاتا ہے۔ صغیر اگر سب سے صغیر ہو تو اُسی کو اصغر کہتے ہیں۔ اصغر بھی اسمِ تفضیل ہے۔ پس اگر دنیا میں کوئی 'براصغر' پایا جاتا ہو، اور یقیناً پایا جاتا ہے، تو اُس سے نسبتاً بڑے ملک کو 'برِصغیر' کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔

صاحبو! اب تک ہم نے جس 'بَر' کی بات کی ہے وہ عربی کا 'بَرّ' ہے اور اس کی 'ر' پر تشدید ہے۔ اس کے معنی خشک خطۂ ارضی کے ہیں۔ دریا اور سمندر وغیرہ اس میں شامل نہیں۔ مگر ایک بَر فارسی کا بھی ہے اور کثیر المعانی ہے۔ تمام معانی کا احاطہ کرنا اس کالم میں ممکن نہیں۔ چند کا ذکر کیے دیتے ہیں۔ جب یہ 'بَر' حرفِ ربط کے طور پر استعمال ہوتا ہے تو پَر، اوپر، کو، میں اور ساتھ وغیرہ کا مفہوم دیتا ہے۔ مثلاً برموقع، برمحل، بروقت، برسرِ راہ اور برسبیلِ تذکرہ وغیرہ۔ لیکن جب یہ لاحقے کے طور پر استعمال ہوتا ہے تو اسم سے فاعل بنانے کے کام آتا ہے۔ مثلاً پیام بر، راہ بر، دل بَر اور نامہ بر وغیرہ۔ فارسی میں 'بَر' کا ایک اور استعمال جسم، سینہ، بغل، آغوش، کنار، پہلو اور نزدیک کے معنوں میں بھی ہوتا ہے۔ اہلِ فارس کی دیکھا دیکھی اُردو والوں نے بھی 'بَر' کو ان معنوں میں استعمال کر لیا۔ مثلاً ''سر پر رام پوری ٹوپی اور بر میں شیروانی''۔ اور مثلاً حضرت قبلہ شاہ خاموش قدَّسَ اللہ سرہٗ کی ایک غزل کا دلچسپ مطلع ہے:

دل بَر ہے بَر میں الحمدللہ
سب کچھ ہے گھر میں الحمدللہ

□□□

(بہ شکریہ: فرائیڈے اسپیشل، کراچی)

مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی (پھلواری شریف، پٹنہ)

امارت شرعیہ بہار کا ترجمان ہفت روزہ 'نقیب' کے ایڈیٹر مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی ولد ماسٹر نورالہدیٰ (مرحوم) یکم مئی 1984 کو مدرسہ احمدیہ ابا بکر پور ویشالی میں تدریس کی خدمت پر مامور ہوئے۔ 1990 میں ان کو بہار اسٹیٹ مدرسہ ایجوکیشن بورڈ نے 'بہار مدرسہ بورڈ' کی تاریخ مرتب کرنے کے لیے پٹنہ بلایا۔ 1994 میں اس پروجیکٹ کی تکمیل کے بعد وہ مدرسہ احمدیہ ابا بکر پور ویشالی چلے گئے اور درس وتدریس سے وابستہ رہے۔ امارت شرعیہ مجلس شوریٰ کے رکن مفتی ثناء الہدیٰ کو 1995 میں امارت شرعیہ بہار واُڈیشہ کی مجلس ارباب حل وعقد کا رکن منتخب کیا گیا۔ مئی 2003 میں امیر شریعت (سادس) سیّد نظام الدین صاحب نے مفتی ثناء الہدیٰ کو نائب ناظم امارت شرعیہ مقرر کیا۔ اس کے بعد وہ دسمبر 2015 سے امارت شرعیہ کے ترجمان ہفت روزہ 'نقیب' کے ایڈیٹر مقرر کیے گئے۔ وہ وفاق المدارس الاسلامیہ بہار کے ناظم اور آل انڈیا مسلم پرسنل لابورڈ کے تاسیسی رکن بھی ہیں۔

مفتی ثناء الہدیٰ قاسمی نے دارالعلوم مئو (اتر پردیش) سے 1973 میں حفظ قرآن مجید کی تکمیل کی۔ دارالعلوم مئو میں عربی چہارم کی کتابیں پڑھیں اور قاری ظفرالاسلام صاحب سے قرأت سبعہ کی بھی تکمیل کی۔ اس کے بعد انہوں نے عصری تعلیم گاہوں کا رخ کیا۔ مظفر پور کے نتیشور کالج سے انٹرمیڈیٹ کے بعد انہوں نے بہار یونیورسٹی سے فارسی میں بی اے (آنرز) کیا اور پہلی پوزیشن حاصل کی۔ فارسی میں ایم اے کے امتحان میں یونیورسٹی میں دوسری پوزیشن حاصل ہوئی۔ مفتی ثناء الہدیٰ نے پروفیسر متین احمد صبا کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کا رجسٹریشن کرایا۔ ان کا موضوع تھا ''مکاتیب شاہ علی منعمی کا تنقیدی وتجزیاتی مطالعہ''۔ پی ایچ ڈی کا مقالہ مکمل کرنے کے باوجود بہ وجوہ ان کو پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض نہیں ہوئی۔ لیکن مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی کو اردو زبان وادب کی گراں قدر خدمات کے اعتراف میں 10 جنوری 2026 کو الکریم یونیورسٹی کٹیہار (بہار) نے اعزازی ڈاکٹریٹ سے نوازا ہے۔ ڈاکٹر راحت حسین نے مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی اور ان کی ادبی خدمات کے موضوع پر پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا اور متھلا یونیورسٹی (دربھنگہ) سے ان کو ڈگری ایوارڈ کی گئی۔ یہ مقالہ کتابی صورت میں شائع ہو چکا ہے۔ مدھے پورہ یونیورسٹی میں بھی ایک ریسرچ اسکالر موصوف کی خدمات پر پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھ رہے ہیں۔ اس کا عنوان ہے ''ثناء الہدیٰ قاسمی کی صحافت کا تنقیدی جائزہ''۔ مفتی محمد ثناء الہدیٰ کو بہار اسٹیٹ مدرسہ ایجوکیشن بورڈ نے پانچ مضامین میں 'فاضل' کی اسناد عطا کیں۔ اس کے ساتھ ہی ان کو جامعہ دینیات اور عربک پرشین بورڈ الہ آباد سے بھی فضیلت کی سند ملی ہے۔

چار درجن سے زائد کتابوں کے مصنف مفتی ثناء الہدیٰ کا ادبی وعلمی سفر جاری ہے۔ ان کے مضامین اخبارات کی زینت بنتے ہیں۔ صوبہ بہار کی سطح پر اردو زبان کے تحفظ کے لیے مفتی صاحب مسلسل جدوجہد کر رہے ہیں۔ ہفت روزہ 'نقیب' کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مفتی صاحب اردو کے تحفظ اور اس کی بقا کے لیے کس قدر فکر مند رہتے ہیں۔

اہم تصانیف: ● تفہیم السنن شرح اردو آثار السنن (دو جلدوں میں) ● نئے مسائل کے شرعی احکام ● فضلائے دارالعلوم اور ان کی قرآنی خدمات ● اتحادِ اُمت اور اختلاف رائے: اصول وآداب ● نقد معتبر (تحقیق وتنقید) ● یادوں کے چراغ (چھ جلدیں) ● آوازہ لفظ وبیان

مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی

● آپ کی تاریخ پیدائش؟

■ 17 نومبر 1958ء مقام: حسن پور گنگھٹی، ضلع مظفر پور، موجودہ ضلع ویشالی (بہار)

● آپ نے کس اسکول میں ابتدائی تعلیم حاصل کی؟

■ گھر پر پھوپھو راشدہ خاتون سے۔ مڈل اسکول بکسانا، وایا مہوا، ضلع ویشالی

● آپ کی مادری زبان اور ذریعہ تعلیم؟

■ اردو

● آپ کے مطالعہ کے موضوعات کیا ہیں؟

■ تفسیر، حدیث، فقہ، اردو ادب

● اِس وقت کون سی کتاب آپ کے زیر مطالعہ ہے؟

■ مقدمہ ابن خلدون

● آپ کے پسندیدہ مصنّفین (ادیب، ناول و افسانہ نگار، شاعر وغیرہ) کون ہیں؟

■ قاری محمد طیب، مولانا ابوالحسن علی ندوی، صادق سردھنوی، نسیم حجازی، کرشن چندر اور اقبال

● آپ کی زندگی میں کس کتاب سے انقلابی تبدیلی رونما ہوئی؟

■ قرآن پاک اور شمائل ترمذی

● حصولِ تعلیم کے دوران میں آپ کو کس نصابی کتاب نے سب سے زیادہ متاثر کیا؟

■ تلخیص المشام، البلاغة الواضحة

● آپ اردو کا کون سا اخبار/ رسالہ خریدتے ہیں؟

■ قومی تنظیم، پندار، انقلاب اور ماہنامہ دارالعلوم دیو بند

● آپ کے گھر کے نوجوان (teen agers) کیا اردو لکھنا پڑھنا جانتے ہیں اور اردو کو اپنی مادری زبان سمجھتے ہیں؟

■ جی ہاں، صدفی صد

● آپ کے نزدیک سیکولر تعلیم کا کیا مفہوم ہے؟

■ علوم وفنون کی تعلیم کے ساتھ مختلف مذاہب کے اعلیٰ اخلاقی اقدار کی شمولیت

● علم وادب کے میدان میں نئی نسل کے تعلیمی وعلمی رجحان کو آپ کس زاویہ سے دیکھتے ہیں؟

■ سوشل میڈیا نے نئی نسل کے تعلیمی وعلمی رجحان کو بڑی حد تک ختم کر دیا ہے

● کیا آپ اپنے ملک کی تعلیمی ترقی سے مطمئن ہیں؟

■ تعلیمی ترقی ہے کہاں؟ سب پیشہ وارانہ تعلیم کی طرف بھاگ رہے ہیں، تا کہ روٹی کے دو ٹکڑے اور شوربے کی ایک پیالی کا حصول آسان ہو جائے

● ملک میں اردو کی بنیادی اور حقیقی ترقی کے اہم نکات کیا ہو سکتے ہیں؟ کیا اردو کی ترقی کے لیے اردو کو روزگار سے جوڑنا ناگزیر ہے؟

■ زبانیں لکھنے، پڑھنے اور بولنے سے زندہ رہتی ہیں، سرکاری مراعات سے نہیں، روزگار سے جوڑنا ضروری نہیں ہے البتہ اس سے دلچسپی میں اضافہ ہوتا ہے

● ملک کی اردو اکادمیوں اور اداروں کے ترقیاتی منصوبوں سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟

■ کئی سال سے معاملہ تعطل کا شکار ہے۔ بہار کے تناظر میں یہ کچھ زیادہ ہی ہے

● وہ کون سی کتاب ہے جسے آپ بار بار پڑھنا چاہتے ہیں؟

■ قرآن کریم

● **مکمل پتہ:** نائب ناظم امارت شرعیہ بہار اُڈیشہ و جھارکھنڈ

پھلواری شریف، پٹنہ-801505 (بہار)

Mobile: 9431003131 - 9304919720

Email: sanaulhoda@gmail.com

نذیر فتح پوری (پونے، مہاراشٹر)

راجستھان، فتح پور شیخاوٹی سے تعلق رکھنے والے نذیر فتح پوری (نذیر احمد ابراہیم جوڑ) کا تعلیمی پس منظر اگرچہ واجبی ہے لیکن اردو زبان وادب کی خدمت کے حوالے سے انہوں نے کارہائے نمایاں انجام دیا ہے۔ادبی رسالہ سہ ماہی 'اسباق' 44 برسوں تک شائع کرتے رہے۔ انہوں نے صرف درجہ پنجم تک تعلیم حاصل کی اور پھر سلسلہ منقطع ہو گیا۔ ایسا لگتا ہے کہ نذیر فتح پوری کی زندگی معروف ادیب وشاعر احسان دانش سے کسی حد تک مطابقت رکھتی ہے۔ نذیر فتح پوری نے ایک سال تک گاؤں کے بازاروں میں بچہ مزدور کے طور پر کام کیا۔ بعد میں اپنے والد کے پاس مہاراشٹر کے شہر پونہ چلے گئے۔ وہاں انہوں نے راج مستری کا کام سیکھا۔ تقریباً دس برس تک وہ راج مستری کا کام ہاتھ سے کرتے رہے۔ پھر اسی شعبے میں انہوں نے ٹھیکیداری شروع کر دی۔

نذیر فتح پوری کا پہلا افسانہ 1970 کے قریب ماہنامہ 'خاتون مشرق' میں شائع ہوا تھا۔ پہلا ناول 'چٹانوں کے بیچ' 1975 میں چھپا۔ اس طرح مختلف موضوعات پر اب تک ان کی 118 کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ ادبی صحافت کے ساتھ جن اصناف پر ان کی تخلیقی کاوش ہیں ان میں شاعری، افسانے، ناول، سفرنامے، تذکرے (ادبی شخصیات) اور مکتوب نگاری قابل توجہ ہیں۔ ادب اطفال کے حوالے سے ان کی آٹھ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ جب ساری دنیا کورونا (Covid:19) کی وبا میں مبتلا تھی تو نذیر فتح پوری کورونا کے دور میں بھی کہانیاں لکھنے میں مصروف تھے۔ کورونا کے موضوع پر نذیر فتح پوری کی اردو میں غالباً پہلی کتاب 'کوروناوائرس بائیس کہانیاں' شائع ہوئی۔

نذیر فتح پوری کی ادبی خدمات اور تخلیقات کو ایک ادبی حلقہ قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے فکر و فن پر تین پی ایچ — ڈی کے مقالے لکھے گئے۔ ایک ایم فل کا مقالہ قلم بند کیا گیا۔ یہی نہیں بلکہ احباب کی جانب سے نذیر فتح پوری کی ادبی خدمات پر 28 کتابیں ترتیب دے کر شائع کی گئیں۔ راجستھان کے اردو نصاب (درجہ چہارم، ششم، دہم) میں نذیر فتح پوری کی نظمیں شامل کی گئیں۔

نذیر فتح پوری کی کتابوں پر مہاراشٹر، اتر پردیش، راجستھان اور بہار کی اردو اکیڈمیز نے انعامات بھی دیے۔ بہار اردو اکیڈمی نے قاضی عبدالودود ایوارڈ دیا۔ مہاراشٹر سے 'ولی دکنی ایوارڈ' دیا گیا، راجستھان سے مخمور سعیدی ایوارڈ عطا کیا گیا۔ پونے کے کسی ادارے نے علامہ اقبال ایوارڈ سے بھی نوازا۔ مہاراشٹر ادب اسلامی کی طرف سے بھی ان کی شاعری پر اعزاز تفویض کیا گیا۔

نذیر فتح پوری کا قلمی سفر پیرانہ سالی میں بھی جاری ہے۔ اس وقت وہ ایک کتاب 'احسان دانش اور مَیں' کی ترتیب میں مصروف ہیں۔

اہم تصانیف: ● جوش پونے میں (2016) ● کوروناوائرس: بائیس کہانیاں
● ہمارے زمانے کی دنیا (زیر طبع) ● مرزا غالب کے نام پچاس خطوط (زیر طبع)
● ڈاکٹر سلیم اختر (لاہور) پونہ میں (زیر طبع) ● مولانا حسرت موہانی پونہ میں (زیر طبع)

نذیر فتح پوری

● آپ کی تاریخ پیدائش؟

■ یکم دسمبر 1946ء مقام: فتح پور شیخاوٹی، ضلع سیکر، راجستھان

● آپ نے کس اسکول میں ابتدائی تعلیم حاصل کی؟

■ اسلامیہ اسکول عیدگاہ، فتح پور شیخاوٹی، راجستھان

● آپ کی مادری زبان اور ذریعہ تعلیم؟

■ اردو۔ راجستھانی

● آپ کے مطالعہ کے موضوعات کیا ہیں؟

■ شاعری، افسانہ، تنقید، تحقیق، تذکرے، ادبی شخصیات، سفرنامے، سوانح عمری

● اِس وقت کون سی کتاب آپ کے زیر مطالعہ ہے؟

■ غالب کے خطوط اور جہانِ دانش از: احسان دانش

● آپ کے پسندیدہ مصنّفین (ادیب، ناول و افسانہ نگار، شاعر وغیرہ) کون ہیں؟

■ ابتدا میں ابن صفی اور کرشن چندر۔ میر تقی میر، خسرو، نظیر

● آپ کی زندگی میں کس کتاب سے انقلابی تبدیلی رونما ہوئی؟

■ بہت سی کتابوں سے بہت کچھ سیکھا

● حصولِ تعلیم کے دوران میں آپ کو کس نصابی کتاب نے سب سے زیادہ متاثر کیا؟

■ درجہ پنجم کے بعد کوئی نصابی کتاب نہیں پڑھی

● آپ اردو کا کون سا اخبار/ رسالہ خریدتے ہیں؟

■ بہت سے۔ 44 برس تک اپنا سہ ماہی ادبی رسالہ 'اسباق' شائع کیا

● آپ کے گھر کے نوجوان (teen agers) کیا اردو لکھنا پڑھنا جانتے ہیں اور اردو کو اپنی مادری زبان سمجھتے ہیں؟

■ کچھ جانتے ہیں کچھ نہیں۔ لیکن اردو کو مادری زبان سب مانتے ہیں

● آپ کے نزدیک سیکولر تعلیم کا کیا مفہوم ہے؟

■ کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

● علم و ادب کے میدان میں نئی نسل کے تعلیمی و علمی رجحان کو آپ کس زاویہ سے دیکھتے ہیں؟

■ علامہ اقبال کے زاویۂ نظر سے

● کیا آپ اپنے ملک کی تعلیمی ترقی سے مطمئن ہیں؟

■ تعلیمی اداروں سے وابستہ حضرات بہتر جواب دے سکتے ہیں

● ملک میں اردو کی بنیادی اور حقیقی ترقی کے اہم نکات کیا ہو سکتے ہیں؟ کیا اردو کی ترقی کے لیے اردو کو روزگار سے جوڑنا ناگزیر ہے؟

■ جو ہیں ان پر بھی عمل کہاں ہو رہا ہے۔ کوئی بھی زبان ہو روزگار فراہم کرے گی تو ترقی بھی کرے گی

● ملک کی اردو اکادمیوں اور اداروں کے ترقیاتی منصوبوں سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟

■ میرے مطمئن ہونے نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اکادمیوں کے وجود پر سوالیہ نشان لگ چکا ہے۔ چند اکادمیوں میں تھوڑی بہت ہلچل نظر آتی ہے اور بس...

● وہ کون سی کتاب ہے جسے آپ بار بار پڑھنا چاہتے ہیں؟

■ مختلف موضوعات پر میری 118 کتابیں ہیں ان پر اکثر نظرثانی کرتا ہوں، اپنی خامیوں اور کوتاہیوں کو تلاش کرتا رہتا ہوں۔ دوسروں کے عیب تلاش کرنے سے بہتر ہے خود کے عیب تلاش کیے جائیں

● **مکمل پتہ:** دفتر اسباق، سائرہ منزل، 230/B/102 ومان درشن، سنجے پارک، پونہ-411032 (مہاراشٹر)

Mobile: 9822516338

سیر حاصل

مبادیاتِ لسانیات

از: ڈاکٹر شاہد حبیب☆

برصغیر میں اردو لسانیات کی روایت اگرچہ ایک صدی سے زیادہ کو محیط ہے، تاہم جدید توضیحی لسانیات، اطلاقی لسانیات، سماجی لسانیات اور نفسیاتی لسانیات جیسے مباحث کو اردو میں مربوط، سادہ اور علمی انداز میں پیش کرنے والی کتابیں اب بھی نسبتاً کم ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اردو دنیا میں جب بھی جدید لسانی مباحث کی بات ہوتی ہے تو چند مخصوص اہلِ علم اور محدود علمی متون کا حوالہ سامنے آتا ہے۔ ایسے ماحول میں پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ کی تازہ تصنیف 'مبادیاتِ لسانیات' نہ صرف ایک خوش آئند اضافہ ہے بلکہ اردو لسانیات کے طلبا، محققین اور عام قارئین کے لیے ایک اہم علمی تحفہ ہے۔ پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ اردو لسانیات کے ان ممتاز اہلِ علم میں شمار کیے جاتے ہیں جنھوں نے جدید لسانی نظریات کو اردو زبان کے حوالے سے نہایت سنجیدگی، علمی دیانت اور تنقیدی بصیرت کے ساتھ پیش کیا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ لسانیات سے ان کی وابستگی اور وہاں تدریس و تحقیق کے طویل تجربے نے ان کے علمی سرمایے کو غیر معمولی وسعت عطا کی۔ ان کی متعدد کتابیں، مثلاً 'زبان، اسلوب اور اسلوبیات'، 'اردو کی لسانی تشکیل'، 'لسانی تناظر' اور 'اسلوبیاتی تنقید' اردو لسانیات میں بنیادی مراجع کی حیثیت اختیار کر چکی ہیں۔ ان کی تازہ تصنیف 'مبادیاتِ لسانیات' اسی علمی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔

زیر تبصرہ کتاب بنیادی طور پر لسانیات کے ابتدائی طالب علموں کے لیے لکھی گئی ہے مگر اس کی افادیت صرف تدریسی سطح تک محدود نہیں۔ کتاب میں لسانیات کے اہم تصورات کو اس انداز سے پیش کیا گیا ہے کہ ایک عام قاری بھی زبان کے سائنسی مطالعے کی بنیادی جہات سے واقف ہو سکتا ہے۔ کتاب کی زبان سادہ، شگفتہ اور تدریجی ہے جبکہ موضوعات کی ترتیب منطقی اور مربوط ہے۔ مصنف نے جدید لسانیات کے بنیادی مباحث کو اردو مثالوں کے ذریعے واضح کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ یہی وصف اس کتاب کو اردو میں لسانیات کی دوسری کتابوں سے ممتاز بناتا ہے۔ مصنف نے اردو قواعد، اسلوبیات، ترجمہ، سماجی لسانیات، نفسیاتی لسانیات اور ادبی تنقید کے میدانوں میں گراں قدر کام کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تصنیفات میں نظری گہرائی کے ساتھ ساتھ تدریسی سہولت بھی پائی جاتی ہے اور یہی خصوصیت 'مبادیاتِ لسانیات' میں بھی نمایاں طور پر موجود ہے۔ مصنف نے محض نظری مباحث نقل نہیں کیے بلکہ اپنے طویل تدریسی تجربے کی روشنی میں ان مباحث کو مرتب کیا ہے۔ کتاب میں موضوعات کی تدریجی تنظیم، اصطلاحات کی وضاحت، اردو مثالوں کا انتخاب اور ابواب کی منطقی تقسیم اس امر کی گواہی دیتی ہے کہ یہ کتاب ایک تجربہ کار معلم کی ذہنی کاوش کا نتیجہ ہے۔

مبادیاتِ لسانیات
مصنف: پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ
صفحات: 140، قیمت: -/250، اشاعت: 2025
ISBN 978-93-6062-130-8
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، D1/16، انصاری روڈ دریا گنج، نئی دہلی-110002

تبصرے کے لیے اپنی کتاب کے دو نسخے ارسال فرمائیں۔ ایک نسخہ موصول ہونے پر تبصرہ شائع نہیں ہوگا۔ (ادارہ)

'مبادیاتِ لسانیات' دس ابواب پر مشتمل ہے۔ ان ابواب کی ترتیب نہایت منظم اور تدریجی ہے۔ ابتدا میں لسانیات کا تعارف اور اس کی شاخوں کو بیان کیا گیا ہے، پھر صوتیات، تجز صوتیات، تشکیلیات، نحو اور معنیات جیسے بنیادی توضیحی مباحث پر گفتگو کی گئی ہے۔ بعد ازاں اطلاقی لسانیات، سماجی لسانیات اور نفسیاتی لسانیات جیسے جدید موضوعات کو شامل کیا گیا ہے۔ کتاب کے آخر میں اصطلاحاتِ لسانیات (اردو۔ انگریزی)، خاکے، جدولیں اور کتابیات شامل ہیں جو اس کی علمی افادیت کو دو چند کر دیتے ہیں۔ کتاب کی سب سے بڑی خوبی اس کی تدریجی تنظیم ہے۔ مصنف نے قاری کو اچانک پیچیدہ مباحث میں داخل نہیں کیا ہے بلکہ بنیادی تعریفوں اور آسان تصورات سے آغاز کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک مبتدی طالب علم بھی بغیر کسی ذہنی دباؤ کے کتاب کے ساتھ آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔

کتاب کے پہلے باب میں مصنف نے لسانیات کی تعریف، زبان کے سائنسی مطالعے، ماہرِ لسانیات کی ذمہ داریوں اور زبان کے تاریخی ارتقا پر گفتگو کی ہے۔ یہاں مصنف نے واضح کیا ہے کہ لسانیات محض زبان سیکھنے یا قواعد یاد کرنے کا نام نہیں بلکہ زبان کے صوتی، صرفی، نحوی اور معنیاتی ڈھانچوں کا سائنسی مطالعہ ہے۔ مصنف کا یہ اصرار قابلِ توجہ ہے کہ زبان ایک سماجی مظہر ہے اور اسے سماجی، ذہنی اور ثقافتی تناظر سے الگ کر کے نہیں سمجھا جا سکتا۔ وہ زبان کو انسانی ذہن کا پیچیدہ نظام قرار دیتے ہیں اور اس امر کی طرف توجہ دلاتے ہیں کہ زبان کا مطالعہ محض ادبیات تک محدود نہیں بلکہ نفسیات، عمرانیات، بشریات اور فلسفے سے بھی گہرا تعلق رکھتا ہے۔ اس باب میں زبان کی تبدیلی اور ارتقا کے مسئلے پر بھی مختصر مگر بامعنی گفتگو کی گئی ہے۔ مصنف نے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ زبان جامد شے نہیں بلکہ مسلسل تغیر پذیر نظام ہے۔ وقت کے ساتھ اس کے صوتی، صرفی اور نحوی ڈھانچے تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ یہی تصور جدید تاریخی لسانیات کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ مصنف نے زبان کے سائنسی مطالعے میں مواد کی اہمیت پر بھی زور دیا ہے۔ ان کے نزدیک لسانی تحقیق محض قیاسی عمل نہیں بلکہ مشاہدے، تجزیے اور لسانی مواد کے منظم مطالعے پر قائم ہوتی ہے۔

کتاب کے دوسرے باب میں تاریخی لسانیات اور توضیحی لسانیات کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ تاریخی لسانیات کے ضمن میں مصنف نے زبانوں کے ارتقا، لسانی تبدیلی، خاندانِ السنہ اور صوتی تغیرات جیسے موضوعات کا اجمالی تعارف کرایا ہے۔ توضیحی لسانیات کے باب میں مصنف نے زبان کو ایک زندہ نظام کے طور پر دیکھنے کی بات کی ہے۔ وہ اس امر پر زور دیتے ہیں کہ کسی زبان کا مطالعہ اس کے موجودہ استعمال کی بنیاد پر کیا جانا چاہیے، نہ کہ صرف تاریخی حوالوں سے۔ یہ نکتہ نظر ساختیاتی لسانیات سے قریب تر ہے اور اردو لسانیات میں جدید علمی رویے کی نمائندگی کرتا ہے۔ مصنف نے تاریخی اور توضیحی مطالعے کے فرق کو سادہ انداز میں واضح کیا ہے۔ مثالوں کے ذریعے بتایا گیا ہے کہ تاریخی لسانیات زبان کے ماضی اور ارتقا پر توجہ دیتی ہے جبکہ توضیحی لسانیات زبان کی موجودہ ساخت اور نظام کا مطالعہ کرتی ہے۔ یہ وضاحت طلبا کے لیے نہایت مفید ہے کیونکہ اردو میں اکثر یہ دونوں تصورات خلط ملط ہو جاتے ہیں۔

کتاب کے تیسرے اور چوتھے ابواب صوتیات اور تجز صوتیات سے متعلق ہیں۔ یہ دونوں ابواب کتاب کے اہم ترین حصوں میں شمار کیے جا سکتے ہیں۔ مصنف نے صوتیات کی تعریف کرتے ہوئے تکلمی اصوات کی پیدائش، ادائیگی اور درجہ بندی پر مفصل گفتگو کی ہے۔ انہوں نے تلفظی صوتیات کے ضمن میں اعضائے تکلم، مخارج اور اصوات کی اقسام کو نہایت آسان انداز میں بیان کیا ہے۔ اردو مثالوں کے ذریعے مصوتوں اور صامتوں کی وضاحت کتاب کی ایک بڑی خوبی ہے۔ تجز صوتیات کے باب میں صوتیے، ذیلی صوتیے، صوتی امتیاز اور بین الاقوامی صوتیاتی ابجد (IPA) کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ مصنف نے اردو صوتیوں کی درجہ بندی کرتے ہوئے اردو کے صوتی نظام کی ساخت کو واضح کیا ہے۔ یہ باب اردو زبان کے صوتی مطالعے کے لیے نہایت اہمیت رکھتا ہے۔ کتاب میں IPA کا مختصر تعارف بھی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ جدید لسانی تحقیق میں بین الاقوامی صوتیاتی نظام سے واقفیت ناگزیر سمجھی جاتی ہے۔ مصنف نے اس پیچیدہ موضوع کو غیر ضروری تفصیلات سے بچاتے ہوئے بنیادی سطح پر پیش کیا ہے جو تدریسی اعتبار سے

موزوں ہے۔ اردو مصوتوں، صوت ارکان اور صمتی خوشوں کی وضاحت اس کتاب کا ایک اہم حصہ ہے۔ مصنف نے اردو کے صوتی نظام کو صرف عربی و فارسی کے اثرات کے تناظر میں نہیں دیکھا ہے بلکہ اسے ایک خودمختار صوتیاتی نظام کے طور پر سمجھنے کی کوشش کی ہے۔

پانچواں باب تشکیلیات سے متعلق ہے۔ اس باب میں لفظ کی ساخت، تکلمی اکائیوں، صرفیوں اور اشتقاقی عمل کی وضاحت کی گئی ہے۔ مصنف نے تشکیلیات کو زبان کے اس شعبے کے طور پر متعارف کرایا ہے جو لفظوں کی اندرونی ساخت اور تشکیل کا مطالعہ کرتا ہے۔ اردو زبان میں لفظ سازی کے عمل، سابقوں، لاحقوں اور مرکبات کی مثالیں اس باب کو نہایت دلچسپ بناتی ہیں۔ مصنف نے اس امر کی وضاحت کی ہے کہ زبان میں نئے الفاظ کس طرح وجود میں آتے ہیں اور صرفی عمل کس طرح زبان کی توسیع کا ذریعہ بنتا ہے۔ مصنف نے جدید لسانی اصطلاحات کو اردو قالب میں ڈھالنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

کتاب کا چھٹا باب نحو سے متعلق ہے۔ یہاں جملے کی ساخت، اجزائے کلام، ترکیبی نظام اور تجزیۂ اجزائے متصل پر گفتگو کی گئی ہے۔ مصنف نے واضح کیا ہے کہ نحو زبان کی اس سطح کا مطالعہ ہے جہاں الفاظ باہم مل کر معنی خیز جملے تشکیل دیتے ہیں۔ مصنف نے جملے کی ساخت کو نہایت منظم انداز میں بیان کیا ہے۔ انہوں نے اردو جملوں کی ساختی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے ترکیب سازی کے اصول واضح کیے ہیں۔ یہ باب اردو قواعد اور جدید نحوی مطالعے کے درمیان ایک پل کی حیثیت رکھتا ہے۔ تجزیۂ اجزائے متصل کی بحث خاص طور پر اہم ہے کیونکہ اس کے ذریعے قاری جملے کے اندرونی رشتوں کو سمجھنے کے قابل ہوتا ہے۔ مصنف نے پیچیدہ نحوی نظریات کو آسان مثالوں کے ذریعے واضح کیا ہے۔ یہی تدریسی انداز کتاب کی سب سے بڑی طاقت ہے۔

ساتواں باب معنیات پر مشتمل ہے۔ مصنف نے معنی کے تصور، لفظی رشتوں، مترادفات، متضادات، اشتراکِ لفظی اور جملوں کے معنیاتی تعلقات پر گفتگو کی ہے۔ معنیات کا موضوع عمومی طور پر تجریدی اور پیچیدہ سمجھا جاتا ہے مگر مصنف نے اسے سادہ مثالوں کے ذریعے واضح کیا ہے۔ انہوں نے اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ زبان صرف صوتی یا نحوی نظام نہیں بلکہ معنی کی ترسیل کا ذریعہ بھی ہے۔ الفاظ کے درمیان معنیاتی رشتوں کی وضاحت کتاب کا ایک اہم حصہ ہے۔ مترادف الفاظ، متضاد الفاظ، جز و کل کے تعلقات اور سیاقی معنی جیسے مباحث کو مختصر مگر جامع انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ مصنف نے معنی کی مختلف اقسام کا ذکر کرتے ہوئے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ معنی محض لغوی نہیں ہوتے بلکہ سماجی، ثقافتی اور سیاقی عوامل بھی ان پر اثرانداز ہوتے ہیں۔

آٹھواں باب اطلاقی لسانیات سے متعلق ہے۔ یہاں اسلوبیات، تدریسِ زبان، لغت نویسی اور ترجمہ نگاری جیسے موضوعات شامل کیے گئے ہیں۔ یہ باب کتاب کے ان حصوں میں سے ہے جہاں مصنف کی علمی مہارت پوری آب وتاب کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ اسلوبیات کے باب میں مصنف نے زبان اور ادب کے باہمی تعلق کو واضح کیا ہے۔ ان کے نزدیک ادبی متن کا مطالعہ صرف جمالیاتی سطح پر نہیں بلکہ لسانی سطح پر بھی کیا جانا چاہیے۔ یہی اسلوبیاتی تنقید کی بنیاد ہے۔ مصنف نے اسلوب کو صرف ایک اندازِ بیان نہیں بلکہ لسانی انتخاب کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ انہوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ ادیب مخصوص لسانی وسائل کے ذریعے اپنے متن میں جمالیاتی اثر پیدا کرتا ہے۔ اسلوبیاتی مطالعہ انہی لسانی وسائل کی شناخت کا نام ہے۔ تدریسِ زبان کے ضمن میں مصنف نے زبان سکھانے کے جدید اصولوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ اس بات کے قائل ہیں کہ زبان کی تدریس محض قواعد یاد کرانے کا عمل نہیں ہے بلکہ یہ عملی استعمال اور ابلاغی صلاحیت پیدا کرنے کا ذریعہ ہونی چاہیے۔ مصنف نے لغت سازی کے اصولوں اور ترجمے کے لسانی مسائل کو اختصار مگر جامعیت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اردو میں اطلاقی لسانیات کے طالب علموں کے لیے یہ مباحث خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

نویں باب میں سماجی لسانیات کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ مصنف نے زبان اور سماج کے باہمی تعلق، لسانی تنوع، بولیوں، طبقاتی فرق، لسانی شناخت اور سماجی عوامل کے اثرات پر

گفتگو کی ہے۔ یہ باب خاص طور پر اس لحاظ سے اہم ہے کہ اردو زبان خود ایک متنوع سماجی و ثقافتی پس منظر رکھتی ہے۔ مصنف نے اس امر کی طرف توجہ دلائی ہے کہ زبان کا استعمال سماجی حیثیت، تعلیم، جنس، علاقہ اور ثقافتی ماحول سے متاثر ہوتا ہے۔ مصنف نے لسانی تنوع کو زبان کی کمزوری نہیں بلکہ اس کی فطری خصوصیت قرار دیا ہے۔ وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ بولیاں اور علاقائی لہجے کسی زبان کی ثروت ہوتے ہیں۔ یہ نکتۂ نظر اردو کے روایتی معیار پسند رویوں سے مختلف اور زیادہ سائنسی ہے۔ سماجی لسانیات کے بنیادی مباحث کو اردو مثالوں کے ذریعے واضح کیا گیا ہے۔ یہی اس کتاب کی امتیازی خصوصیت ہے کہ مصنف نے صرف مغربی نظریات نقل کرنے پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ وہ اردو لسانی ماحول سے انہیں مربوط کرتے ہیں۔

کتاب کا آخری باب نفسیاتی لسانیات سے متعلق ہے۔ یہاں زبان کے اکتساب، ذہنی عمل، بچے کی لسانی نشوونما اور زبان سیکھنے کے مراحل پر گفتگو کی گئی ہے۔ مصنف نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ بچہ زبان کیسے سیکھتا ہے؟ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے زبان کے اکتسابی مراحل کو سادہ انداز میں بیان کیا ہے۔ بچے کے ابتدائی صوتی اظہار سے لے کر مکمل جملہ سازی تک کے مراحل کی وضاحت کتاب کے اہم حصوں میں شامل ہے۔ نفسیاتی لسانیات کا باب اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اردو میں اس موضوع پر بنیادی سطح کی کتابیں بہت کم ہیں۔

'مبادیاتِ لسانیات' کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ اس کے توسط سے اردو میں جدید لسانیات کا ایک مربوط ابتدائی تعارف فراہم کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے ذریعے ایک طالب علم لسانیات کے تقریباً تمام بنیادی شعبوں سے واقف ہو جاتا ہے۔ کتاب کی زبان سادہ مگر علمی ہے۔ مصنف نے مشکل اصطلاحات کو حتی الامکان اردو قالب میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگرچہ بعض مقامات پر انگریزی اصطلاحات کا استعمال ناگزیر محسوس ہوتا ہے مگر مجموعی طور پر کتاب اردو قاری کے لیے قابلِ فہم ہے۔ یہ کتاب اردو میڈیم اسکولس، مدارس اور جامعات میں لسانیات کے ابتدائی نصاب کے طور پر استعمال کی جاسکتی ہے۔ خاص طور پر ان طلبہ کے لیے یہ کتاب نہایت مفید ہے جو پہلی مرتبہ لسانیات کا مطالعہ کر رہے ہوں۔

'مبادیاتِ لسانیات' اگرچہ اپنی نوعیت کی ایک نہایت اہم اور مفید کتاب ہے تاہم چند مقامات پر مزید توسیع کی گنجائش محسوس ہوتی ہے۔ مثلاً جدید نظری لسانیات، خصوصاً ساختیات، پیداواری قواعد، عملی لسانیات، پراگمیٹکس اور تجزیۂ مکالمہ جیسے مباحث پر مزید گفتگو کی جا سکتی تھی۔ اسی طرح کمپیوٹیشنل لسانیات، کارپس لسانیات اور ڈیجیٹل زبانیات جیسے جدید موضوعات کو بھی مختصر طور پر شامل کیا جا سکتا تھا کیونکہ عصرِ حاضر میں لسانیات کا دائرہ ان نئی جہات تک وسیع ہو چکا ہے۔ اردو میں ایسی جامع اور مربوط بنیادی کتابیں کم دستیاب ہیں، اس لیے 'مبادیاتِ لسانیات' کی اہمیت مسلّم ہے۔ اردو لسانیات کی تاریخ میں چند ہی ایسی کتابیں ہیں جنہوں نے اپنے عہد میں بنیادی نوعیت کی علمی ضرورت پوری کی ہے۔ 'مبادیاتِ لسانیات' کو بھی اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ کتاب اردو دنیا میں جدید لسانی شعور کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کر سکتی ہے۔ خاص طور پر ان طلبا اور قارئین کے لیے جو زبان کو محض قواعد یا ادب تک محدود سمجھتے ہیں، یہ کتاب زبان کے سائنسی، سماجی اور ذہنی پہلوؤں کو سمجھنے کا دروازہ کھولتی ہے۔ یہ کتاب اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اس میں اردو زبان کو محض مطالعے کے موضوع کے طور پر نہیں بلکہ ایک زندہ اور متحرک لسانی نظام کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

□□□

[بقیہ 'غالب ثنائے خواجہ...' صفحہ 14 سے آگے]

عام خیال کے مطابق غالب جیسے بڑے شاعر کے یہاں نعت رسول (ﷺ) کا نہ پایا جانا سخت حیران کن تھا، لیکن اس کتاب نے اس حیرت کا پردہ چاک کیا اور کم وبیش 700، ایسے فارسی اشعار کی نشاندہی کی جن کا مضمون نعت رسول ہے۔

میں صبیح رحمانی صاحب کی اس کوشش و کاوش پر پُرخلوص مبارکباد پیش کرتا ہوں، مجھے امید ہے کہ کتاب کے موضوع کی ندرت اور مشمولہ مضامین کی افادیت و اہمیت کے سبب غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی بھی ادارۂ یادگارِ غالب کراچی کی طرح اس کا ایک ہندوستانی ایڈیشن جلد شائع کرے گا۔

□□□

دنیا عورت کی نظر میں
مشرق و مغرب کا سفرنامہ

از: ڈاکٹر عمیر منظر☆

دنیا عورت کی نظر میں: مشرق و مغرب کا سفرنامہ (متن مع مقدمہ، حواشی، ضمیمے)
مصنفہ: بیگم نواب سربلند جنگ
مرتب: ڈینیل ماخرویچ
صفحات: 408، قیمت: -/600، اشاعت: 2025
ISBN 978-93-82775-46-1
ناشر: دلّی کتاب گھر، 3961 گلی خانخاناں، جامع مسجد، دہلی-110006 موبائل نمبر: 9818530916

اردو کے ابتدائی سفرناموں میں بیگم نواب سربلند جنگ کے سفر کا روزنامچہ بھی شامل ہے۔انہوں نے اپنے قلم سے ایک دنیا کی سیر کرائی ہے۔جو دلچسپ اور معلوماتی ہے۔کم وبیش پانچ ماہ کے اس سفر میں ٹرین، کشتی، بحری جہاز، اونٹ کی سواری اور بعض دیگر ذرائع سفر کا ذکر کیا ہے۔بیگم نواب صاحبہ کا سفر خوشگوار احساسات کا حامل ہے۔وہ حیدرآباد سے روانہ ہوئیں مکہ معظّمہ، مدینہ منورہ، مصر، شام ہوتے ہوئے قسطنطنیہ گئیں اور پھر انگلستان ہوتے ہوئے حیدرآباد آگئیں۔یہ سفر 12 نومبر 1909 تا 3 اپریل 1910 کو محیط ہے۔سفر حج کی وجہ سے اس سفرنامے کو خاص اہمیت حاصل ہے۔سفر کا یہ روزنامچہ 1935 میں پہلی بار 'دنیا عورت کی نظر میں، مشرق و مغرب کا سفرنامہ' کے نام سے خواجہ بک ڈپو، جامع مسجد دہلی سے شائع ہوا تھا۔یہی سفرنامہ کچھ اضافوں اور ضمیموں کے ساتھ اگست 2025 میں دلی کتاب گھر جامع مسجد سے شائع ہوا ہے۔امریکی اسکالر ڈینیل ماخرویچ جو نارتھ ویسٹرن یونیورسٹی (امریکہ) سے وابستہ ہیں، انہوں نے اسے از سر نو مرتب کیا ہے اور بیگم صاحبہ کے ساتھ ساتھ ان کے شوہر نواب حمید اللہ خاں سربلند کے 'سفرنامہ مدینہ منورہ' اور 'قسطنطنیہ' کو بطور ضمیمہ (۱۔۲) اس کتاب میں شامل کیا ہے۔سربلند جنگ کے چند خطوط، شجرہ نسب اور تاریخی تصاویر کو بھی بطور ضمیمہ کتاب کا حصہ بنایا گیا ہے۔نواب حمید اللہ خاں سربلند کے دونوں سفرنامے 1914 تک شائع ہو چکے تھے۔اب ان تمام سفرناموں کو یکجا کر دیا گیا ہے۔اس لیے کتاب 'دنیا عورت کی نظر میں، مشرق و مغرب کا سفرنامہ' اپنے پہلے ایڈیشن سے بہت مختلف ہوگئی ہے۔تعارف، حواشی اور فرہنگ نے کتاب کی اہمیت کو دو چند کر دیا ہے۔اس سفرنامہ کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈینیل ماخرویچ لکھتے ہیں:

''یہ کتاب مورخین اور تاریخ کے شائقین کے لیے کسی بیش بہا خزانے سے کم نہیں ہے۔بیگم سربلند اپنے لیے لکھ رہی تھیں، قارئین کے لیے نہیں۔نہ وہ عطیہ فیضی کی طرح علم پھیلانا چاہ رہی تھیں اور نہ ہی سلطان جہاں بیگم کی طرح سیاسی چالیں چل رہی تھیں۔ان کی کتاب میں جو مشاہدات اور تاثرات درج ہیں وہ سچے ہیں اور دل سے نکلے ہوئے ہیں جو اُن کی چشم بینا نے دیکھا اور قلب القلوب نے محسوس کیا، اس کو الفاظ کے سانچے میں ڈھال دیا۔اسی لیے ہم ان کی تصنیف کو پڑھ کر سمجھ سکتے ہیں کہ بیسویں صدی کی اول دہائی میں ایک اعلیٰ طبقہ کی دولت مند خاتون مسافر پر کیا گزرتی ہے۔'' (ص 17-18)

بیگم نواب سربلند جنگ کو مدینہ منورہ سے عشق تھا۔پہلی بار وہ 1909 میں حج اور زیارت کو گئیں۔دوسری بار 1934 میں اور 1937 میں ان کا آخری سفر تھا۔ارض مقدس سے غیر معمولی تعلق کی بنا پر ہی وہ اپنے کو مدینہ کی خاک نشیں لکھتی تھیں۔مدینہ کی یاد ان کے لیے سکون قلب تھی۔یہ قلبی لگاؤ کا ہی نتیجہ تھا کہ ان

کے شوہر حمید اللہ سربلند جنگ (منصف عدالت عظمیٰ، حیدرآباد دکن) نے جب ان سے یہ کہا کہ کیا تم اس سال حج کو چلو گی تو وہ فوراً تیار ہو گئیں حالانکہ بعض اعزا انہیں چاہتے تھے کہ اس سال یہ سفر کیا جائے۔ اسی ارض مقدس کے صدقے انہوں نے مصر و شام، اٹلی، فرانس اور انگلستان کی سیاحت کی۔ اسی لیے انہوں نے اسے مشرق و مغرب کا سفر نامہ کہا ہے۔ دراصل انہوں نے اسے ڈائری کے طور پر لکھا تھا۔ اس میں سفر کی بہت سی جزئیات اور اپنی پسند و ناپسند کا حال بھی لکھا ہے، جو بہت دلچسپ اور کہیں کہیں حیرت انگیز بھی ہے۔ موقع و محل کے لحاظ سے ان کے انداز کی شگفتگی بہت خوب ہے۔

سفر کی تیاریاں کئی ماہ پہلے شروع ہو گئی تھیں۔ البتہ 12 نومبر 1909 بمطابق 27 شوال 1327 ہجری کو حیدرآباد سے بذریعہ ٹرین روانہ ہوئے۔ گلبرگہ ہوتے ہوئے 29 شوال بمطابق 14 نومبر 1909 کو بامبے (موجودہ ممبئی) پہنچیں۔ یہاں سے کشتی کے ذریعہ 'سالسٹ' نامی بحری جہاز پر سوار ہوئے جو پی۔ اینڈ۔ او کمپنی کا تھا۔ یہ جہاز غیر معمولی سہولتوں سے آراستہ تھا۔ کھانے پینے کا نہایت عمدہ انتظام۔ ہر چیز میں سلیقہ اور قرینہ۔ آرام و آسائش کے مختلف رنگ۔ اس سفر نامہ میں ان کے معمولات بھی حیرت انگیز تھے۔ نماز اور وظائف کا اہتمام قابل رشک حد تک ہے۔ بیگم صاحبہ نے پردے سے بھی کہیں سمجھوتا نہیں کیا۔ ان کی ملنساری، غریبوں اور ناداروں کا خیال اور انسان دوستی وغیرہ کے مناظر بھی خوب ہیں۔ جہاز کی پہلی صبح کے بارے میں لکھا ہے کہ صبح اٹھ کر نماز فجر ادا کی۔ پھر سی باتھ لیا۔ سی باتھ لینے سے جسم نہایت صاف ہو گیا۔ نماز فجر اور سی بات کا ذکر وہ بہت اہتمام سے کرتی ہیں۔ سات بجے مٹن چاپ کا ناشتہ کیا۔ جب کہ گیارہ بجے ویٹر، بیفٹی (گائے کے گوشت کی یخنی) لے کر آیا۔ جہاز میں موجود دیگر خواتین سے دوستی اور تعلق کا احوال بھی لکھا ہے۔ ان سے گفتگو اور بحث و مباحثہ کے بعض احوال بھی۔ ایک بار کسی خاتون نے ہندوستانی رسم و رواج پر نکتہ چینی کی تو انہوں نے اس کا زبردست انداز میں دفاع کیا۔ عربوں سے نادیدہ عقیدت اور ان کی زبان سے بے پناہ محبت ان کی تحریروں سے جھلکتی ہے۔ سفر میں متعدد مقامات پر ان کا ذکر کرتے ہوئے سفر نامہ نگار کے یہاں ایک جوش کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ لوگوں کے ذکر میں ان کی زبان کے بارے میں ضرور لکھتی ہیں۔ ایک جگہ لکھا ہے کہ ''تمام باشندے انگریزی اور عربی بولتے ہیں۔ انگریزی تتلا تتلا کر بولتے ہیں''۔ پورٹ سعید کی ایک دکان میں دکان دار نے انہیں دیکھ کر مرحبا کہا تو خوش ہوئیں۔ سفر نامہ میں ایک جگہ لکھتی ہیں:

''عدن تو بالکل خشک مقام تھا مگر سوئز سرسبز نظر آتا ہے۔ یہاں بھی سب لوگ عرب معلوم ہوتے ہیں۔ لباس بھی عربی ہے، سب مسلمان ہیں۔ عربوں نے اپنی اپنی کشتیاں لا کر جہازوں سے باندھ دی ہیں۔ بڑی بڑی ٹوکریاں لے کر جہاز پر چڑھ آئے اور اپنا اپنا سامان کھولا۔ طرح طرح کی اشیاء لائے ہیں۔ صاحب و میم صاحبان خریدنے لگے۔ میں نے بھی تین تین عدد ہار، ایک جوڑ چوڑیوں کا، ایک کالا رومال جس پر بہت اچھی کامدانی بنی تھی، خریدا اور تھوڑی عربی بھی ان سے بولی۔ وہ بہت خوش ہوئے۔'' (دنیا عورت کی نظر میں،... ص: 84)

24 نومبر کو حافا (حیفا) پہنچ گئے۔ یہاں سے بذریعہ ٹرین مدینہ منورہ کے لیے روانہ ہوئے۔ واضح رہے کہ عثمانی سلطنت کے زمانے میں 1908 تا 1916 کے دوران دمشق سے مدینہ تک ریل چلتی تھی۔ پہلی عالمی جنگ کے دوران حجاز بھی جنگی تباہ کاریوں کا شکار ہو گیا۔ حجاز ریلوے کی ایک شاخ حیفا تک جاتی تھی۔ یہیں پر اتر کر ان لوگوں نے نظرت اور طبریہ کی سیر بھی کی، یہ دونوں مقامات اسرائیل کے شمالی حصے میں ہیں۔ نظرت عیسائیوں کے مقدس مقام کی وجہ سے جانا جاتا ہے۔ اسے حضرت عیسیٰ کا شہر بھی کہا جاتا ہے کیونکہ ان کا بچپن یہیں گزرا تھا۔ حیفا میں عربی زبان رائج ہے۔ عیسائی بھی عربی بولتے ہیں۔ نظرت میں عیسائی بچے بھی عربی بولتے ہوئے ملے۔ جس سے سفر نامہ نگار نے اپنے حال پر افسوس ظاہر کیا کیونکہ وہ عربی بولنے پر قادر نہیں تھیں۔ یہاں پر حضرت عیسیٰ کی جائے پیدائش اور بی بی مریم کی عبادت کے مقام کی زیارت کے بعد طبریہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ طبریہ میں حضرت سلیمان کا حمام دیکھا۔ اس کے بارے میں مشہور ہے کہ گٹھیا اور جوڑوں کے درد کے مریض یہاں ہفتہ دو ہفتہ قیام کر کے نہاتے ہیں اور بحکم خدا شفا ہوتی

ہے۔ یہاں سے حیفا جانے والی ریل پر سوار ہو کر درہ (درعا) پہنچے۔ وہاں سے اگلی ٹرین سے مدینہ کے لیے روانہ ہوئے اور 30 نومبر کو مدینہ پہنچے۔ یہاں پہنچ کر عقیدت ومحبت کے حصار میں وہ آجاتی ہیں۔ ایک جگہ لکھتی ہیں:

''تمام رات میری عجیب حالت رہی نہ نیند ہی تھی اور نہ بیداری ہی تھی۔ شب کے بارہ بجے نواب صاحب نے تہجد کے لیے وضو کیا۔ پھر حرم شریف میں حاضر ہو گئے۔ مگر میں اسی تصور آقا میں پڑی رہی، یہاں تک کہ صبح ہوگئی۔'' (ص 112)

یہاں سے دمشق کی سیر کے لیے نکلے، بیروت، پورٹ سعید، کوہ طور سے ہوتے 17 دسمبر 1909 کو جدہ پہنچے۔ یہاں سے یہ قافلہ اونٹوں پر مکہ کے لیے روانہ ہوا اور 19 دسمبر کو حدود حرم میں داخل ہو گیا۔ یہاں پہنچ کر ان کی بے تابی اور بے قراری دراصل ایک مسلمان کے دل کی آواز ہے۔ بالکل وہی کیفیت کہ ''کعبے پہ پڑی جب پہلی نظر کیا چیز ہے دنیا بھول گیا۔'' ارکان حج کی ادائی کے مناظر اور خشوع وخضوع کی جو کیفیت ہے وہی اس کا حاصل ہے۔ کعبے کو دیکھنا، حطیم میں آنسوؤں کا رواں رہنا، ہر شے میں شانِ باری نظر آنا، خوش ہونا اور خوش ہو کر یاد خدا میں مصروف ہو جانا، سفرنامے کا اہم حصہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ سفرنامہ نگار نے ارض مقدس کے حوالے سے اپنے احساسات اور تجربات میں کہیں بھی غیر ضروری باتوں کو آنے نہیں دیا ہے۔ ارکان ومناسک کی ادائی میں نہایت محتاط رویہ اختیار کیا۔ کسی بھی رکن کو نظر انداز نہیں ہونے دیا۔ اور کہیں کوئی منفی بات نہیں لکھی ہے۔ منیٰ سے عرفات کے لیے روانگی کے مرحلے کی یہ دلچسپ گفتگو ملاحظہ کریں:

''نواب صاحب نے مجھ سے کہا کہ 'تم بھی محمود احمد کو لے کر مع ساز وسامان شب کے دو بجے ہی جبل عرفات کے لیے روانہ ہو جاؤ۔ صبح کی نماز کا انتظار نہ کرو۔ لوگ کثرت سے ہیں دیر نہ ہو جائے۔ ایسے وقت پر پہنچ جانا کہ خطبہ وہاں سن لیا جائے۔' میں نے عرض کیا کہ بہت اچھا۔ مگر میں ساڑھے تین بجے روانہ ہونا چاہتی ہوں کیونکہ نماز شافعی کا چار بجے ہو جاتا ہے اور یقین ہے ہمارا اونٹ آدھے گھنٹے تک تو ضرور سرحد منیٰ میں رہے گا۔ پس میں اونٹ پر ہی نماز فجر ادا کرلوں گی تاکہ میری پانچوں نمازیں سرحد منیٰ میں پوری ہو جائیں۔ لہٰذا ہم دونوں اس پر راضی ہو گئے۔'' (ص 150)

جبل عرفات کے لیے روانگی، عرفہ کا روزہ، مزدلفہ کی منزل، منیٰ میں داخلہ، شیطان پر کنکری، ان سب کے بیان میں جا بجا ان کا یہ احساس بھی سامنے آتا ہے کہ یہ متبرک دن کس قدر جلد گزرتے جا رہے ہیں۔ قربانی اور شیطان پر کنکری مار کر انہوں نے شوہر سے مکہ مکرمہ جانے کی اجازت چاہی تو انہوں نے کہا کہ اونٹ نہیں ہیں۔ بیگم نواب نے عرض کیا کہ میں آپ کے خچر سے ہی چلی جاؤں گی۔ خانہ کعبہ کی کشش انہیں کھینچتی چلی گئی۔ وہاں پہنچ کر اور نماز وطواف میں مصروف ہو گئیں۔ بیگم صاحبہ کا خیال تھا کہ آج خانہ کعبہ میں بھیڑ کم ہوگی اور اس طرح مجھے حجر اسود کو قریب سے بوسہ دینے کا موقع مل جائے گا مگر ان کے بقول ''واہ رے تیری شان کہ سینکڑوں تیرے بندے کہیں اور سے اتنے آ گئے ہیں کہ آج بھی بوسہ دور سے ہی نصیب ہوا''۔

جس نیک جذبے اور بے پناہ عقیدت کے ساتھ یہ سفر شروع ہوا تھا اس کے مناظر جگہ جگہ دیکھنے کو ملتے ہیں۔ صبر وشکر کی ایک موہنی تصویر اس سفرنامہ کی صورت میں بیگم صاحبہ کی ابھرتی ہے۔ کس عقیدت اور محبت سے وہ مکہ کے در ودیوار کو دیکھتی ہیں۔ زیارت جنت المعلیٰ اور رسول مقبول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جائے ولادت، زیارت کے وقت ان کی جذباتی کیفیت ان کی تحریر سے عیاں ہے۔ 5 جنوری 1910 کو یہ قافلہ بوجھل قدموں کے ساتھ مکہ مکرمہ سے جدہ کے لیے روانہ ہو گیا جہاں سے ان کی اگلی منزل قسطنطنیہ ہے۔ شاہان مصر کی سوکھی ہوئی لاشوں کا تذکرہ انہوں نے بہت افسوس اور حیرت کے ساتھ کیا ہے۔ قسطنطنیہ کی شاندار مساجد کا ذکر خاص طور پر کیا گیا ہے۔ یہ شہر بھی بہت خوب صورت ہے۔ حضرت ابو ایوب انصاری کے مزار کی زیارت کا بھی ذکر کیا ہے۔ ترک بہنوں سے ملاقات کا دلچسپ قصہ بھی خوب ہے۔ ترکیہ میں بچوں کی خوش الحانی، عورتوں نے دلہن کے کپڑے پہن کر دکھائے۔ بیگم صاحبہ سے بھی ہندوستانی میں کچھ گانے کی فرمائش کی گئی۔ انہوں نے اپنی کہی ہوئی غزلیں سنائیں (ص 193) اسی سے واضح ہوتا ہے کہ بیگم صاحبہ شاعری بھی کرتی تھیں۔ ان کا تخلص اخترؔ تھا۔ شعر دیکھیے:

زہے نصیب مدینہ مقام ہوجائے
در حبیب پہ میرا سلام ہوجائے

3فروری 1910 کو سلطان معظم سے ملاقات ،سلطان عبدالحمید خاں کے محل کی سیر اور سلطان المعظم کے عطیہ کا ذکر بیگم صاحبہ نے بہت والہانہ انداز میں کیا ہے۔سلطان سے ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے محل کے بارے میں لکھا ہے کہ ''محل کی آرائش کا حال بیان نہیں کرسکتی بس دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔'' سلطان عبدالحمید خاں کا محل ایک اونچے اور سرسبز وشاداب پہاڑ پر ہے۔بیگم صاحبہ نے لکھا ہے کہ دو بجے سے چھ بجے تک ہم لوگ محل میں پھرے مگر محل ختم نہیں ہوا۔لندن کی سیر وتفریح کے علاوہ سر چارلس اور پرنس آف ویلز کی دعوتوں کا ذکر ہے۔ویلز نے تو خیر چائے کی ہی دعوت دی تھی۔

بیگم صاحبہ کا یہ سفرنامہ ان کے احساسات وجذبات کا آئینہ ہے۔لطف وانبساط کا پہلو وہ جانے نہیں دیتیں۔اس کے آئینہ میں بیگم صاحبہ اور ان کے شوہر دونوں کے عادات واطوار اور مزاج واخلاق کو دیکھا جاسکتا ہے۔بیگم صاحبہ نے سفرنامہ میں ہر جگہ اپنے شوہر کو سرکار لکھا ہے اور ہر جگہ ان کے تئیں سراپا نیاز مندی کا رویہ ہے۔ان کی باتوں کو بے چوں چرا قبول کرلینا اور اپنے معروضات کو نہایت شائستگی سے رکھنا اس سفرنامے کا ایک روشن پہلو ہے۔

نواب حمید اللّٰہ خاں کے سفرناموں میں تاریخی، جغرافیائی اور موجودہ صورت حال کی معلومات زیادہ ہے۔ ان کے سفرنامے میں اعداد وشمار کا خاص اہتمام ملتا ہے۔ جذبات و احساسات کی وہ کیفیت جو بیگم صاحبہ کا خاصہ ہے یہاں مفقود ہے۔روضہ نبی کی زیارت دونوں کے سفرنامے کا حصہ ہے لیکن بیگم صاحبہ کے یہاں روضہ نبی کی زیارت کے لیے بے قراری تھی۔وہاں پہنچ کر آنسو کا سیل تھا جو تھمنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ دل تھا کہ خوشی کے مارے پھولے نہیں سما رہا تھا۔اور اسی کیفیت میں ذکر واذکار اور نوافل کا ذکر انہوں نے کیا ہے جبکہ نواب صاحب روضہ کے متعلق معلومات فراہم کرتے ہیں۔یہ معلومات بہت اہم ہیں۔اب تو مسجد نبوی اور روضہ نبی کا نقشہ ہی بدلا ہوا ہے مگر ایک صدی پہلے کی اس کی حالت کیا تھی نواب صاحب کے سفرنامے سے اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''روضہ مبارک میں سنگ مرمر کا فرش کیا ہوا ہے۔اور اس پر قالین بچھے ہوئے ہیں۔روضہ مبارک کے اطراف نہایت مصفا چاندی وتانبے وپیتل کی بنی ہوئی جالیاں لگی ہوئی ہیں۔اور ان پر سونے کا ملمع کیا ہوا ہے ... سلطان المعظم کی جانب سے بڑے بڑے شمع دان جن میں نہایت موٹی مومی موم بتیاں روشن ہوتی ہیں، چڑھائے گئے ہیں۔رات کے وقت اس قدر روشنی ہوتی ہے کہ روشنی کی چمک سے جو جالیوں پر پڑتی ہے، آنکھ ان کو دیکھنے سے عاجز رہ جاتی ہے۔روضہ مبارک ایک حجرہ کی شکل کا بنا ہوا ہے جو پچپن فٹ طویل اور پچاس فٹ عریض ہے۔روضہ مبارک مشرقی جانب واقع ہے۔مسجد اور روضہ مبارک کے درمیان چھبیس فٹ عریض جانب جنوب ایک راستہ ہے اور وہی راستہ جانب شرق بیس فٹ عریض ہے۔''

(ص:285۔286)

سفرنامہ مدینہ منورہ (اشاعت 1914) کو ایک دستاویزی معلومات کا درجہ دیا جاسکتا ہے۔مسجد نبوی کے مختلف ابواب اور اطراف مدینہ کی مختلف مساجد کی تفصیل بیان کی گئی ہے نیز جبل احد کے بارے میں لکھا گیا ہے۔سفرنامہ نگار بدوی شورش کی وجہ سے مسجد قبلتین کی زیارت سے اگرچہ محروم رہے لیکن مسجد کے بارے میں مختصر معلومات سفرنامے میں شامل ہے۔

سفرنامہ قسطنطنیہ حیدرآباد دکن سے شائع ہوا۔قسطنطنیہ کے حسن و جمال کے بارے میں لکھا ہے کہ قدرت نے اسے بے شمار خوبیاں اور دل فریبیاں عطا کی ہیں۔یہاں کی مشہور جگہوں میں اسلام بول غلطہ، پیرا وغیرہ کا تعارف کرایا ہے۔غلطہ کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ حضرت عیسیٰ سے تین سو برس پہلے سے آباد ہے جبکہ پیرا کے بارے میں لکھا ہے کہ یہاں کی سڑکوں پر پتھر کا فرش کیا ہوا ہے۔صدر اعظم ترکی اور یہاں کے دیگر معززین سے ملاقات کا مختصراً ذکر کیا ہے۔قسطنطنیہ کی مساجد کا ذکر خاص اہتمام سے کیا گیا ہے۔سب سے پہلے مسجد ایا صوفیا کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے کہ ''زمانۂ قدیم میں یہ مسجد سینٹ صوفیا کی گرجا تھی''۔اس کے علاوہ وہاں کی آٹھ دیگر مساجد کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہاں کی قدیم عمارتوں اور شاندار محلات،

پھولوں کے باغات وغیرہ دیکھ کر سلاطین عثمانی کی شان وشوکت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کی مختلف یادگاریں دیکھ کر عثمانی سلطنت کی شجاعت اور بہادری نمایاں ہوتی ہے۔ عثمانی سلطنت سے ہندوستانی مسلمانوں کا مذہبی اور جذباتی دونوں رشتہ رہا ہے۔ اس سفرنامہ میں جو معلومات درج کی گئی ہیں اور جس طرح سے وہاں کی تفاصیل بیان کی گئی ہیں وہ اسی رشتے کی غماز ہیں۔ آج سے ایک صدی پہلے اس سلطنت کے بارے میں اس قدر تفصیل اور جزئیات کے ساتھ کوئی تحریر کہاں دستیاب رہی ہوگی۔ یہ سفرنامے ہمارے جذبات واحساسات کی سیرابی کا سبب ہیں اور عثمانی سلطنت سے گہرے رشتے کے بھی غماز ہیں۔ یقین ہے کہ ان سفرناموں کو پہلے پہل پڑھنے والوں کے لیے ایک اہم روحانی غذا ثابت ہوئے ہوں گے اور انہوں نے سفرنامہ نگاروں کو ڈھیروں دعائیں دی ہوں گی۔ اب یہی دعائیں ڈینیل ماخرویچ کو دینی ہوگی کہ جن کی وجہ سے ہماری تاریخ اور تہذیب کا اہم سرمایہ محفوظ ہو گیا۔

اختر النساء بیگم، نواب سربلند جنگ کا تعلق مغلیہ خاندان، لوہارو اور الور جیسی ریاستوں سے رہا ہے۔ ان کی والدہ ریاست لوہارو کے وزیر کی بیٹی تھیں۔ ان کے شوہر حمید اللہ سربلند جنگ، سمیع اللہ خاں کے فرزند تھے۔ جو علی گڑھ تحریک کے رہنما اور سر سید احمد خاں کے قریبی ساتھیوں میں تھے۔ کیمبرج یونیورسٹی سے ایم۔ اے کے علاوہ وہ بیرسٹر ایٹ لا بھی تھے۔ اسی وجہ سے وہ عدالت عظمی حیدرآباد دکن کے چیف جسٹس مقرر ہوئے۔ شاہ عالم گیر ثانی اور مرزا غالب ان کے اعزہ میں تھے۔ ان کے والد مرزا آغا بیگ 1857 کے ہنگاموں میں لکھنؤ آ گئے۔ یہیں تعلیم حاصل کی اور پھر تلاش معاش میں حیدرآباد چلے گئے۔ دکن میں سالار جنگ کی اولاد کے استاد مقرر ہوئے اس کے بعد نظام محبوب علی خاں کے۔ اردو کے ابتدائی سفرنامہ نگاروں میں بیگم سربلند جنگ کا شمار ہوتا ہے۔ 1957 میں ان کا دلی میں انتقال ہوا۔ خواجہ باقی باللہ کے مزار کے زیر سایہ مدفون ہیں۔

یہ سفرنامہ ایک عرصے سے نایاب تھا۔ 2025 میں امریکی اسکالر ڈینیل ماخرویچ نے اس سفرنامہ کو از سر نو مرتب کر دیا۔ اس کے مطالعہ سے ان کی محنت اور سنجیدگی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ پرمغز اور معلوماتی مقدمہ، حواشی اور چار ضمیموں کے ساتھ اسے شائع کیا گیا ہے۔ بہت سی گمشدہ سوانحی کڑیوں کو بھی مرتب کرنے کی کوشش کی گئی ہے اس ذیل میں شجرہ نسب خاصا اہمیت کا حامل ہے۔

نئے ایڈیشن میں صفحہ 6 پر بیگم سربلند کے جو نعتیہ شعر دیے گئے ہیں اس میں چوتھا مصرعہ خارج از بحر ہے اور یہ امیر مینائی کی نعت کی مشہور زمین ہے مطلع دونوں کا یکساں ہے اور آخری شعر میں تھوڑی بہت تبدیلی ہے۔ مکمل نعت دیکھنے کی صورت میں ہی کوئی حتمی رائے قائم کی جاسکتی ہے۔ اسی طرح صفحہ 69 پر 28 شوال ہونا چاہیے۔ پہلے ایڈیشن میں یہی تاریخ ہے واضح رہے کہ اگلے صفحہ پر 29 شوال ہے۔

ڈینیل ماخرویچ نے حواشی اور متن میں شامل انگریزی ناموں کی وضاحت کے علاوہ ایک فرہنگ بھی شامل کی ہے۔ اس وجہ سے موجودہ سفرنامے کی اہمیت دوچند ہوگئی ہے۔ کتاب میں شامل نجیب جنگ اور عابد الٰہی کی تحریریں معلومات افزا ہیں۔ واضح رہے کہ بیگم نواب سربلند سابق بیوروکریٹ اور سابق وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی نجیب جنگ کی دادی ہیں۔ اس ادبی دستاویز کو دلّی کتاب گھر نے نہایت اہتمام سے شائع کیا ہے۔

☆ مبصر سے رابطہ: ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ اردو۔ مانو لکھنؤ کیمپس

Mobile: 8004050865

Email: oomairmanzar@manuu.edu.in

❑❑❑

میں نے لکھنا کیسے شروع کیا؟

... حیات و کائنات کا کون سا ایسا مسئلہ ہے جسے میں نے اپنی کسی نہ کسی کتاب میں نہ چھیڑا ہو۔ لیکن میرا طریقِ کار ہمیشہ عام روش سے الگ تھلگ رہا ہے۔

ابنِ صفی

ابرار احمد کی فکر انگیز اسلامی کتابیں

فہم قرآن

تفہیم قرآن مجید کے حوالے سے نئی نسل کے لیے ایک گراں قدر تحفہ

صفحات: 480 قیمت:-/350 ISBN 978-93-83239-89-4

نقوشِ کفِ پائے مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم

رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ مبارکہ عام فہم انداز میں ... طلبا اور نوجوانوں کے لیے ایک اہم کتاب

صفحات: 424 قیمت:-/300 ISBN 978-93-83239-75-7

سیّد البشر (صلی اللہ علیہ وسلم)

سیرتِ رسولؐ پر نادر اور جداگانہ اُسلوب میں ایک اہم تالیف

اس کتاب میں واقعات اور کرداروں کے ساتھ سیرتؐ سے متعلق

ذیلی عنوان قائم کر کے سیرت کے اصل پیغام کو ذہنوں میں نقش کرنے کی کوشش کی گئی ہے

صفحات:800 (مجلد) قیمت:-/800 اشاعت:2022 ISBN 978-93-90579-46-4

کائنات گواہ ہے

اللہ کی نشانیوں کے تعلق سے قرآن اور سائنس کے موضوع پر فکر انگیز کتاب

قرآن انسانوں کے لیے کتابِ ہدایت ہے۔ اس کتاب میں قرآنی آیات کے

حوالوں کے ساتھ سائنسی آرا اور افکار کا جائزہ لیا گیا ہے۔

صفحات: 248 قیمت:-/300 اشاعت:2023 ISBN 978-93-90579-40-2

اوراقِ حکمت

قرآنی آیات اور مضامین کے حوالے سے دینی موضوعات پر اہم تالیف

صفحات: 672 قیمت:-/800 اشاعت:2025 ISBN 978-93-90579-94-5

تذکیر

منتخب قرآنی آیات کے حوالے سے یہ کتاب اتحادِ اُمت کی حقیقی دعوت دیتی ہے

صفحات: 640 قیمت:-/700 اشاعت: اکتوبر 2025 ISBN 978-93-90579-93-8

Advtt. 01/2026

ناشر: القاسم پبلی کیشنز، سوائی مادھو پور (راجستھان) Mobile: 9414308409

دہلی میں ملنے کا پتہ: اردو بک ریویو، نئی دہلی۔ فون نمبر 011-44753890

نقد و تبصرہ

علی گڑھ کالج اور شیراز (مکمل سفرنامہ)

مصنف: سیّد جلال الدین حیدر

تدوین و تعلیق: ارشد مسعود ہاشمی

تبصرہ: اسعد فیصل فاروقی☆

ہندوستان کے ایران سے قدیمی تہذیبی و علمی رشتے ہیں۔ جدید تاریخ میں بھی یہ رشتے قائم رہے ہیں۔ علی گڑھ جو سرسید کی تعلیمی تحریک کا مرکز رہا ہے، اس نے بھی ایرانی طلبا کی تعلیم کے سلسلے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ سرسید کے زمانے میں نہ صرف معروف ایرانی شاعر سنجر تہرانی (پ 1847) کا قیام 1888 میں علی گڑھ میں رہا بلکہ انہوں نے علی گڑھ تحریک اور سرسید کی عقیدت میں قصیدے بھی کہے۔

سرسید کے علی گڑھ کالج نے جیسے جیسے ترقی کے مدراج طے کیے اس نے مختلف علاقوں کے طلبا کو اپنی جانب متوجہ کیا۔ سرسید کے زمانے میں ہی جنوری 1896 میں سب سے پہلے مشہد کے معروف ایرانی خاندان کے فرد آقا مرزا محمد خاں کو حکام انگریزی کی جانب سے مدرستہ العلوم علی گڑھ میں تعلیم کے لیے بھیجا گیا تھا۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ 14 جنوری 1896 کے مطابق آقا مرزا محمد خاں ایرانی الاصل والنسل ہیں اور سعادت مند خیال کیے جاتے ہیں۔ فارسی ان کی مادری زبان ہے اور وہ نہایت شستہ فارسی بولتے ہیں۔ ان کے والد غفران مآب حاجی مرزا عباس خاں برٹش گورنمنٹ کی جانب سے مشہد میں سفیر تھے۔ (دیکھئے مدرستہ العلوم علی گڑھ، علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ 14 جنوری 1896)۔

صفحات: 168 قیمت: -/400 اشاعت: 2025

ISBN 978-93-90579-87-7

ناشر: اپلائڈ بکس، دریا گنج، نئی دہلی-110002

Tel. 011-44753890 Mobile: 9953630788

سرسید کے انتقال کے بعد بیرون ہند کے طلبا کا علی گڑھ کالج میں داخلہ جاری رہا۔ 1903 میں ایران کے طلبا کو علی گڑھ کالج کی جانب مائل کرنے کے لیے باقاعدہ ایک وفد ایران میرولایت حسین کی سربراہی میں بھیجا گیا اور کئی ایرانی طلبا علی گڑھ کالج میں داخل ہوئے۔ اس کے بعد 1911 میں بحرین، عراق، عمان اور دیگر عرب ممالک کے طلبا (مولانا) عبدالحق بغدادی کی کوششوں سے علی گڑھ تعلیم کے غرض سے آئے۔ (دیکھئے عرب اور علی گڑھ کالج، علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ 1911) سرسید کے انتقال کے بعد جب کالج کو یونیورسٹی میں تبدیل کرنے کی تحریک چلی اور سرسید میموریل فنڈ قائم ہوا، اس وقت بھی ایران کے 43 رؤسا کی جانب سے غیر معمولی چندہ موصول ہوا تھا۔ (دیکھئے رپورٹ اعانت از ایران برائے سرسید احمد میموریل فنڈ، علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ یکم مارچ 1911۔)

اسرار الحق مجاز (1955-1911) نے 'نذر علی گڑھ' (1936) کے ایک مصرعے میں ایران کے علمی شہر 'شیراز' کا ذکر ایک خوبصورت استعارے کے طور پر کیا ہے۔ اس طرح مجاز نے شیراز اور علی گڑھ کے رشتے کو لازوال بنا دیا ہے:

ہر شام ہے شام مصر یہاں، ہر شب ہے شب شیراز یہاں
پے سارے جہاں کا سوز یہاں اور سارے جہاں کا ساز یہاں

اس شعر میں مجاز نے علی گڑھ کی راتوں کو ایران کے علمی شہر شیراز کی راتوں سے تشبیہ دی ہے۔ شیراز وہ شہر ہے جس نے دنیا کو حافظ اور سعدی جیسے عظیم شعرا دیئے۔

آزادی کے بعد بھی ایران کے طلبا کے لیے علی گڑھ کے دروازے کھلے رہے اور بالخصوص ایران و عراق جنگ کے دوران 1980-1970 کی دہائی میں بڑی تعداد میں ایرانی طالب علم تعلیم کی غرض سے علی گڑھ میں مقیم رہے۔ تعلیم و تحقیق کا یہ سلسلہ آج بھی بدستور جاری ہے۔

یہاں یہ تمہید کیوں پیش کی جا رہی ہے، اس کی وجہ سید جلال الدین حیدر کا سفرنامہ 'علی گڑھ کالج اور شیراز' ہے۔ واضح ہو کہ علی گڑھ کالج میں ایرانی طلبا کی ایک گروپ کی شکل میں آمد

سب سے پہلے 1903 میں ہوئی، اس سے قبل ایک ایک دو طالب علم تعلیم کے غرض سے آتے تھے۔ ان ایرانی طلبا کو علی گڑھ کالج کی جانب رجوع کرنے میں موریسن (1863-1936) کا کلیدی کردار رہا اور انہوں نے باقاعدہ کالج سے ایک تعلیمی وفد ایران بھیجنے کی درخواست کی۔ جب کالج نے یہ وفد تشکیل دیا تو اس میں دو اساتذہ میر ولایت حسین (1861-1949)، مولوی جلال الدین حیدر (1872-1948) اور دو طلبا سید ابو محمد اور جمیل احمد شامل تھے۔ اس وفد کی کوششوں سے ایران کے تہران، شیراز اور بوشہر سے کالج میں ۹ طلبا داخل ہوئے۔ اس طرح علی گڑھ میں ہندوستان کے مختلف صوبوں کے علاوہ پہلی بار غیر ملکی طلبا کی حصول تعلیم کے لیے آمد ہوئی۔

میر ولایت حسین اور مولوی جلال الدین حیدر نے ایران کے اس سفر کی روداد بھی لکھی۔ میر ولایت حسین کا سفر نامہ علاحدہ سے شائع نہیں ہوا بلکہ ان کی آپ بیتی میں 'ایران کا سفر' کے عنوان سے شامل ہے اور یہ آپ بیتی پہلی بار 1970 میں شائع ہوئی، اور 2024 میں سرسید اکیڈمی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے اس کو دوبارہ حواشی و تعلیقات کے ساتھ شائع کیا۔

مولوی جلال الدین حیدر کا سفر نامہ سب سے پہلے علی گڑھ اولڈ بوائز کے میگزین 'اولڈ بوائے' کے 1913-1912 کے پرچوں میں قسط وار شائع ہوا اور پھر ان کی خودنوشت (سوانح عمری و سفر نامے) 1946 میں 'سفر شیراز' کے عنوان سے شامل ہوا۔

خوشی کا مقام ہے کہ حال ہی میں اس سفر نامہ کی اشاعت جدید پروفیسر ارشد مسعود ہاشمی (شعبۂ اردو، جے پرکاش یونیورسٹی، چھپرہ) کے ذریعہ عمل میں آئی ہے۔ انہوں نے مولوی جلال الدین حیدر کے سفر نامہ کی نہ صرف تدوین کی ہے بلکہ اس میں حواشی و تعلیقات کا بھی گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ ارشد مسعود نے تدوین کے اس اہم کام کو انجام دیتے ہوئے سید جلال الدین حیدر کے دونوں سفر ناموں یعنی اولڈ بوائے میں قسط وار شائع اور 1946 کے سفر نامے کے متون کو پیش نظر رکھا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے میر ولایت حسین کی آپ بیتی میں شامل ایران کا سفر اور علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ (1903-1902) میں شائع رپورٹوں کو بھی ملحوظ رکھا ہے۔ اس طرح انہوں نے سید جلال الدین حیدر کے سفر نامہ ایران کو 'علی گڑھ کالج اور شیراز' (مکمل سفر نامہ) کے عنوان سے بڑی عرق ریزی سے مرتب کیا ہے۔ اس سفر نامے میں جن جن اہم شہروں، علاقوں اور شخصیات کا تذکرہ ملتا ہے، اور اس سفر کے دوران جن جن واقعات کا ظہور عمل میں آیا، پروفیسر ارشد مسعود ہاشمی نے ان کے بارے میں اضافی معلومات کے ساتھ حواشی میں ان کا ذکر کر دیا ہے۔

شافع قدوائی کتاب کے مقدمے 'سرنامہ' میں لکھتے ہیں:

''کالج کا ایک پانچ رکنی وفد 1903 میں ایران گیا اور اسے خاطر خواہ کامیابی بھی ملی۔ وفد کے دو ارکان، میر ولایت حسین اور سید جلال الدین حیدر نے سفر نامے بھی لکھے۔ میر ولایت حسین کے مختصر سفر نامہ کا ذکر کیا جاتا ہے اور یہ روداد ان کی خودنوشت میں شامل ہے۔ سید جلال الدین حیدر کے سفر نامے سے کم ہی لوگ واقف ہیں۔ یہ دونوں سفر نامے برطانیہ کے زیر نگیں ہندوستان میں غیر ملکی طلبا کی آمد اور علی گڑھ کالج کے تعلیمی، تربیتی اور تہذیبی ڈسکورس کے اولین نقوش کا ایک مرتعش رویا (vision) خلق کرتے ہیں۔ اردو میں سفر ناموں سے متعلق تحقیقی اور تنقیدی جائزے میں ان کا ذکر شاذ کیا جاتا ہے۔ اس تحقیقی اور تدوینی فروگزاشت کا علمی سطح پر قرار واقعی ازالہ کرنے کا قابل قدر کارنامہ تحقیقی دقتِ نظری سے متصف ادیب پروفیسر ارشد مسعود ہاشمی نے انجام دیا ہے۔''

علی گڑھ کالج اور شیراز کے تمہیدی باب بعنوان 'مدرستہ العلوم کا شیراز وفد: چار سفر نامے' میں پروفیسر ارشد مسعود ہاشمی کی تحقیق شافہ کی مثال ہے جس میں انہوں نے میر ولایت حسین کے دو سفر نامے یعنی رسالہ تہذیب، لاہور (2008) میں شائع اور ان کی آپ بیتی (1970) میں شامل، اور مولوی جلال الدین حیدر کے دو سفر ناموں کا علمی و معروضی محاکمہ پیش کر دیا ہے۔

ارشد مسعود ہاشمی اپنے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

''پیش نظر متن کی تدوین و ترتیب مولوی حاجی سید جلال الدین حیدر کی 'خودنوشت' میں موجود 'سفر شیراز ۱۹۰۳ء' اور 'اولڈ بوائے' میں شائع سفر ناموں کی مختلف اقساط کی مدد سے کی گئی ہے۔ ضمائم کے طور پر گزٹ کے محولہ بالا شماروں کے متون بھی شامل کر دیے گئے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ مدرستہ العلوم کے شیراز

وفد کا مکمل سفرنامہ ہے۔

کتاب کے آخیر میں ضمیمے کے بطور میر ولاحسین کی رپورٹ 'مدرستہ العلوم علی گڑھ اور شیراز ڈپوٹیشن' مع فہرست طلبائے ایران، اور علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کا ایرانی طلبا کی علی گڑھ آمد کے سلسلہ میں اداریہ بعنوان' کالج کے سلسلے میں ایک نئی کڑی' بھی شامل کر دیے گئے ہیں۔

ارشد مسعود ہاشمی صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے سید جلال الدین حیدر کے اس سفر نامہ کی تدوین و تعلیق بخوبی انجام دی اور علی گڑھ کالج کے سلسلے سے ایک اہم ماخذ کو پیش کیا، جس کی رسائی علمی حلقوں سے اب تک باہر تھی۔ کتاب میں شامل حواشی، کتابیات اور اشاریہ نے اس کی قدرو قیمت بڑھادی ہے۔امید ہے یہ کتاب اردو قارئین میں قبولیت کی نگاہ سے دیکھی جائے گی اور علی گڑھ تحریک کے سلسلہ میں ایک اہم ماخذ ثابت ہوگی۔ کتاب کا سرورق دیدہ زیب، کاغذ بہترین ہے۔

☆ مبصر سے رابطہ: موبائل نمبر 9412595891 (علی گڑھ)

□□□

پروفیسر محسن عثمانی ندوی کی تصنیفات اہل علم و ادب کی نظر میں

مرتب: معصوم مرادآبادی

تبصرہ: اشتیاق ظہیر ندوی☆

پروفیسر محسن عثمانی ندوی عصرِ حاضر کے ممتاز قلم کار، صاحب طرز ادیب، معروف محقق و دانشور، صاحبِ فضل و کمال، دل دردمند، فکر ارجمند اور زبان ہوش مند کے امین و پاسباں ہیں۔ جدید و قدیم کے دلکش امتزاج نے ان کی علمی ساخت کو ایک ایسے حسین توازن سے آراستہ کیا ہے جو نہ روایت پرستی کا اسیر ہے اور نہ بے سمت جدّت کا شکار۔فکری اعتدال، اسلامی تاریخ

صفحات: 268 قیمت:-/300 اشاعت اوّل:2024
ناشر: ہیومن ویلفیئر کونسل، النور منزل، D-29 ابوالفضل انکلیو، اوکھلا، نئی دہلی-110025 موبائل:9654625663

و ثقافت اور عظمت رفتہ کی بازیابی کی کاوشیں ان کی شخصیت کا امتیاز ہیں۔ پروفیسر محسن عثمانی نے دو دھاراؤں سے کسبِ فیض کیا: ندوہ سے عمق، اعتدال اور توازن کشید کیا، دیوبندی تصلب و اصولی پختگی بھی آپ کو وافر مقدار میں میسر ہوئی، اور یونیورسٹیز نے عصری تہذیبی شعور کی فکری کائنات کو غیر معمولی وسعت عطا کی۔ انھوں نے مختلف میدانوں میں کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ درس و تدریس سے وابستہ رہنے کے باوجود روزِ اول سے قلم سے رشتہ مضبوط رہا۔سینکڑوں مضامین اور درجنوں کتابیں اس بات پر شاہدِ عدل ہیں۔ انھوں نے ہر موضوع پر لکھا، علمی و تحقیقی کتابیں بھی، فکری و ادبی موشگافیاں بھی ان کا طرۂ امتیاز رہیں۔ ان کا قلم سیال، فکر وسیع، ذوق بلند اور خیالات عالی ہیں۔ ان کے افکار پر اسلامی تہذیب و تمدن اور اس کی بازیابی کا گہرا غلبہ رہا ہے۔ان کی تحریروں میں مصروشام کے المیے ہوں یا عالمِ عرب و عجم کی تہذیبی کشمکش، ہر جگہ ایک زندہ امت کا درد اور ایک بیدار تہذیبی شعور جھلکتا ہے۔ ادب کی وادیاں طے کیں، نقد و تحقیق کی شاہ راہوں کو عبور کیا، ساتھ ہی ساتھ چودہ سو سے زائد مشاہیرِ اسلام کا ایک وقیع انسائیکلو پیڈیا بھی مرتب کر کے معاصر اردو دنیا پر احسان کیا۔

ان کے اسلوب میں بلا کی سلاست و روانی، شفافیت، ادبی رنگ و آہنگ، شیرینی و حلاوت ہے۔شعر و ادب کا بلند ترین ذوق ان کی شخصیت کا انفرادی پہلو ہے۔ بقول (مولانا) خالد سیف اللہ رحمانی:

''ایسا لگتا ہے کہ زبان و ادب کی حلاوت ازخود ان کے نوکِ قلم سے ٹپکنے لگتی ہے اور خوبصورت الفاظ اور طبع زاد و دل آویز تعبیرات ایک وفا شعار کنیز کی طرح دست بستہ ان کے سامنے کھڑی ہیں۔'' (ص:11)

پروفیسر عثمانی کی شخصیت کا ایک درخشاں پہلو امتِ مسلمہ کے تئیں دردمندی و دلسوزی ہے۔ وہ ملتِ اسلامیہ کے حوالے سے مسلسل لکھتے ہیں، انہیں ان کا ماضی یاد دلاتے ہیں، حال سے آگاہ کرتے ہیں اور مستقبل کے لیے بیدار کرتے نظر آتے ہیں۔ بقولِ ڈاکٹر عبدالباری:

''محسن عثمانی کو خدا نے دردمند دل اور ذہنِ بیدار عطا کیا

ہے۔ وہ کہیں بھی ہوں، کسی ملک کی سیر کر رہے ہوں، میرتقی میر کی طرح اپنے اندرون میں برابر جھانکتے رہتے ہیں، جہاں ان کی ملت کی زبوں حالی کی بے شمار تصویریں آویزاں ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ مصنف نے امت کے غم کو اپنا غم بنا رکھا ہے؛ وہ جہاں بھی ہوتے ہیں اس متاعِ غم کو اپنے سینے سے لگائے رکھتے ہیں۔'' (ص:10)

انہوں نے عربی واردو دونوں زبانوں پر یکساں قدرت سے کام لیا، عربی کے پروفیسر ہونے کے باوجود اردو دنیا پر ان کی فکری چھاپ نمایاں نظر آتی ہے۔ محسن عثمانی ندوی کی معروف کتابوں میں مطالعۂ شعر و ادب، حالات حاضرہ اور ہندوستانی مسلمان، حالات بدل سکتے ہیں، کتابوں کے درمیاں، ستاروں کے درمیاں، مطالعۂ مذاہب، وحید الدین خان دانشوروں کی نظر میں، سلسلہ مشاہیر علوم اسلامیہ، کلیم عاجز شخصیت اور شاعری، اردو زبان کا تحفظ اور ہماری ذمہ داری، دنیا کو خوب دیکھا، تقدیر امم کا راز داں، مصر کی عربی صحافت، فضائل اخلاق، يحدثونك عن السيد أبي الحسن، نجيب محفوظ في ميزان النقد اور قضيه البعث الإسلامي وغیرہ شامل ہیں۔

ان کتابوں پر سرسری نگاہ دوڑائیے تو یہ حقیقت طشت از بام ہوتی چلی جائے گی کہ انہوں نے زبان وقلم سے تلوار کا کام لیا ہے۔ ان کا قلم ان کے ضمیر کی امانت ہے جس کی آواز نے انہیں ہمیشہ بے چین رکھا اور یہی بے چینی و کرب اور اضطراب ان کے اسلوب میں نمایاں ہیں۔ 'مصر و شام خون سے لالہ زار' جیسی کتاب محسن عثمانی کا ہی طرۂ امتیاز ہے، جب حکومتی جبر اور سرکاری دباؤ پر بڑے بڑے ادیبوں نے سرِ تسلیم خم کیا تب بھی محسن عثمانی لکھتے رہے اور حق و صداقت کی صدا بلند کرتے رہے۔ انہوں نے سیم وزر کی پروا کیے بغیر حق کی ترجمانی کا فریضہ بہترین طریقہ پر انجام دیا۔ تیونس، لیبیا، شام وفلسطین ہوں یا دیگر عرب ممالک سب کی کرتوتوں کو زبان وقلم سے بے نقاب کیا۔ ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل، حالات کی سنگینی و نزاکت، ملت اسلامیہ ہندیہ کو درپیش چیلنجز کی سرکوبی کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے۔ جہاں بانی و جہاں آرائی کا بھولا سبق یاد دلاتے رہے۔ 'حالات بدل سکتے ہیں' جیسی کتاب پروفیسر عثمانی کی ملی دردمندی، فکری بلندی، اور اسلامی سوز و گداز کی روشن دلیل ہے۔ وہ اپنی تحریروں میں اس کھلی حقیقت کا برملا اظہار کرتے ہیں کہ برعظیم ہند و پاک میں حفاظت دین کے لیے نمایاں کاوشیں تو ہوئیں لیکن دعوت عامہ، اسلامی تعلیمات کے فروغ اور خیر امت کے فریضے کی ادائی میں کوتاہی ہوئی اور مسلسل ہو رہی ہے۔ یہی اس امت کے زوال کی داستان ہے؛ حالانکہ عثمانی صاحب اپنے اس تفرد کی بنیاد پر مباحث کے گرداب میں بھی رہتے ہیں؛ لیکن وہ وہی کہتے ہیں جو حق لگتی بات ہے۔ بقول اقبال:

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق
نے اَبلہِ مسجد ہُوں، نہ تہذیب کا فرزند
اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں، بیگانے بھی ناخوش
میں زہرِ ہَلاہِل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

زیرنظر کتاب 'پروفیسر محسن عثمانی ندوی کی تصنیفات: اہل علم وادب کی نظر میں' پروفیسر محسن عثمانی ندوی کی انہیں دردمندی، ملی سوز و ساز، فکری کائنات اور ادبی کاوشوں پر اہل علم و ادب کے تجزیوں اور تبصروں کا مجموعہ ہے جسے معروف صحافی و ادیب معصوم مرادآبادی نے مرتب کیا ہے۔ یہ کتاب محض تجزیاتی تحریروں کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک نابغہ روزگار، داعی، ادیب اور مفکر کی فکری وادبی شخصیت کی خدمات کا جامع ترین تعارف بھی ہے۔ کوئی اگر عثمانی صاحب کو ایک نظر میں دیکھنا اور سمجھنا چاہے تو یہ کتاب اس کی مراد برلائے گی۔

کتاب بنیادی طور پر تین حصوں میں منقسم ہے۔ پیش لفظ میں جناب معصوم مرادآبادی نے کتاب کا خوبصورت اور بامعنی تعارف پیش فرمایا ہے۔

مرے قلم کا سفر منزل بہ منزل بی گویا مصنف کی کہانی خود ان کی زبانی کے مترادف ہے۔ اس مضمون میں پروفیسر محسن عثمانی نے اپنی روداد بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اپنا درد دل بھی بیان فرمایا ہے۔ جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے انہوں نے اپنے ادبی وفکری اور قلمی سفر کو بیان فرمایا ہے۔ مصنف کا زاویۂ نگاہ دوسروں سے مختلف ہے۔ ان کے سوچنے کا انداز الگ مگر پُرکشش ہے۔ انہوں نے اس سفر کے دوران پیش آئے تمام

احوال اس خوش اسلوبی سے بیان کیے ہیں کہ قاری ایک لمحے کے لیے توقف نہیں کرسکتا۔ زبان و بیان کی چاشنی ہر ہر سطر سے عیاں ہے۔ ابتدائی تعلیم کے ذکر سے لے کر ندوہ و دیوبند کے بعد ان کے قلمی سفر میں خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری (پٹنہ) کا بڑا کردار ہے۔ مطالعہ کا شوق و ذوق اور کتب بینی کا جذبہ ان کو فکری ورثہ کے طور پر ملا تھا۔ انہوں نے پٹنہ لائبریری میں رہتے ہوئے سینکڑوں کتابوں کا مطالعہ کیا۔ مخطوطات سے استفادہ کیا، یہیں سے ان کی فکری جولان گاہ کو ہوا ملی اور وہ ایک معروف قلم کار کے طور پر ابھرے۔

پروفیسر محسن عثمانی کا یہ سفر مختلف راہوں سے گزرتا ہوا اپنے عروج کو پہنچتا ہے۔ انہوں نے اپنے فکری سفر کی روداد میں اردو اور اہل اردو کو اپنا مقام یاد دلایا ہے۔ ادب کی بزم تعارف بھی اور یونیورسٹی کے اساتذہ پر تنقید بھی۔ مصنف نئی نسل کا کتابوں سے رشتہ ٹوٹ جانے اور کبابوں سے دوستی پر نالہ کناں ہے۔ آپ کا قلم مانند تلوار ہے بقول فاضل مصنف ''قلم کو صرف نشتر تحقیق نہیں ہونا چاہیے۔ قلم سے کبھی کبھی تلوار کا کام بھی لینا چاہیے۔'' مزید لکھتے ہیں کہ'' میں ایک باشعور انسان اور صاحبِ قلم تھا۔ میں آستانۂ حکومت کی جبہ سائی کے لیے تیار نہیں تھا، جہاں بینی میری فطرت تھی اور میں کسی جمشید کا ساغر نہیں تھا، شام لہولہان ہو، مصر میں کوئی فرعون فریب دے کر تخت حکومت پر براجمان ہو، فلسطین اور اہل فلسطین پر ستم ڈھایئے جا رہے ہوں اور حرمین شریفین کا ایک فرماں روا جمال خاشقجی کا قاتل بن جائے، جو برسر انصاف بننے کے بجائے برسر باطل بن جائے اور جو اپنے مزاج و کردار کے اعتبار سے حرم میں رہ کر بھی حرم کے لیے نامحرم ہو، اس کا مزاج دین سے برہم ہو، جو دعوے کے اعتبار سے حرمین کا خادم اور اپنے طرز عمل کے اعتبار سے دین کا ہادم ہو، میں ایسا صاحب قلم تھا جو یہ محسوس کرتا رہا کہ میرا قلم امانت میرے ضمیر کی ہے۔(ص 24)

کتاب پڑھنے اور تحریر لکھنے پر ترغیب دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ'' کتاب دراصل مصنف کی شخصیت کی عکاس ہوتی ہے شخص اور شخصیت میں فرق ہوتا ہے شخص خد و خال کا نام ہے اور شخصیت فکر و خیال کا نام ہے، شخص رنگ و شکل و قامت کا نام ہے، شخصیت اخلاق و عادات اور تصور حیات کا نام ہے، شخص بصارت ہے اور شخصیت بصیرت، شخص نظر ہے اور شخصیت نظریہ، شخصی ملاقات سے انسان چشم و گوش و چہرہ اور بیرون کو دیکھ سکتا ہے، کتاب پڑھ کر انسان مصنف کے جذبات اور فکری رویہ اور اندرون سے واقف ہوسکتا ہے۔ اس بات کی سب سے بہتر ترجمانی ایک عرب جاہلی شاعر زہیر بن ابی سلمیٰ نے کی ہے:

لسان الفتى نصف ونصف فؤاده

ولم يبق إلا صورة اللحم والدم

یہ مستقل مضمون اس قابل ہے کہ کتابچہ کی شکل میں شائع ہوسکے۔ قلم سے متعلق افراد کے لیے اس میں بیش قیمت موتی ہیں اور اسلوب کی وہ چاشنی کہ انسان اس کے سحر میں کھوتا چلا جائے۔ یہی دراصل عثمانی صاحب کا سب سے بڑا امتیاز ہے جو انہیں دیگر قلم کاروں سے ممتاز کرتا ہے۔

معصوم مرادآبادی نے بڑے سلیقے اور تندہی سے اس کتاب کو مرتب فرما کر پروفیسر محسن عثمانی ندوی پر تحقیق کرنے والوں کے لیے وقیع کام انجام دیا ہے۔ پہلا باب تعارف و توصیف پر مبنی ہے۔ جس میں مختلف اہل علم و ادب کے آٹھ مضامین شامل ہیں، یہ گویا مصنف کی خدمات، اسلوب کی دلکشی، فکر کی بالیدگی، دقیقہ سنجی وفکری موشگافیوں کا بہترین نمونہ ہے۔ ان کے اسلوب کا تعارف کراتے ہوئے حالات بدل سکتے ہیں کتاب پر سید حامد (سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) لکھتے ہیں'' مولانا آزاد کی مرصع نثر جو حسن استدلال سے آراستہ اور فصیح و بلیغ تراکیب اور منتخب اور خوش صوت الفاظ اور برمحل اشعار سے مزین ہے، محسن عثمانی کی نثر پر اثر انداز ہوتی ہوئی جا بجا نظر آتی ہے۔ راقم سطور نے فاضل مصنف کی اٹھان اور ان کی فکر اور اسلوب نگارش کو جوہر قابل کی کشش سے مسحور ہو کر تحت نگاہ رکھا ہے۔ اسے اللہ سے قوی امید ہے کہ بالآخر ان کا شمار ہمارے صاحب طرز ادیبوں میں ہونے لگے گا۔'' (ص 53)

فاضل مصنف کا تعارف کراتے ہوئے ڈاکٹر محمد منظور عالم لکھتے ہیں کہ'' یونیورسٹی کے اساتذہ سے یہ شکایت عام طور پر کی جاتی ہے کہ وہ ملی مسائل کے تئیں باشعور نہیں ہوتے اور ملت کی اجتماعی کوششوں کا ربط نہیں ہوتا ہے، پروفیسر محسن عثمانی نے

حیدرآباد منتقل ہونے کے بعد خصوصیت کے ساتھ اس الزام کو دھونے کی کوشش کی، انہوں نے یہ ثابت کیا کہ وہ ملت کا درد رکھتے ہیں اور ملت کے مسائل ان کی تحریروں کا خصوصی موضوع ہیں۔'' (ص 39)

پہلا باب در اصل محسن عثمانی کی عظمت و رفعت، اقبال مندی و سوز دروں، اسلوب کی بلندی اور طرز تحریر کی دلکشی کا اعتراف پیش کرتا ہے۔

دوسرا باب عثمانی صاحب کی کتابوں کے تبصروں پر مشتمل ہے۔ جن میں سرفہرست حالات بدل سکتے ہیں، حالات حاضرہ اور ہندوستانی مسلمان، اسلام کا نظام سیاست وحکومت، دنیا کو خوب دیکھا، مشاہیر اسلام سیریز، مطالعۂ سیرت و تاریخ و تہذیب، مطالعۂ مذاہب، ہندو مذہب مطالعہ اور جائزہ، مطالعۂ تصنیفات، کتابوں کے درمیاں، ستاروں کے درمیاں، دے مجھ کو زباں اور، عرب دنیا میں انقلاب جیسی دوسری کتابیں شامل ہیں۔ ان کتابوں میں ممتاز اہل قلم ومعروف دانشوروں کے وقیع تجزیے شامل ہیں۔ طوالت سے بچنے کے لیے محض ناموں پر اکتفا کیا گیا ہے ورنہ ہر کتاب اس لائق ہے کہ مختصر تعارف پیش کیا جائے۔

تیسرے باب میں بھی کتابوں پر تبصرے ہیں لیکن اس کی نوعیت ادبی ہے۔ پروفیسر محسن عثمانی کا شعری و ادبی ذوق نہایت نفیس اور اعلیٰ ہے یہی وجہ ہے کہ وہ تحریر وتقریر میں اس سے بحسن خوب کام لیتے ہیں۔ شعر وادب پر مشتمل معروف کتابوں میں، کلیم عاجز: وہ ایک شاخ نہال غم، کلیم عاجز شخصیت اور شاعری، نقد شعر وادب، مطالعہ شعر وادب، اُردو کا تحفظ اور ہماری ذمہ داریاں، جیسی اہم ترین کتابیں شامل ہیں، بعض باقاعدہ تالیف ہیں تو کچھ مختلف مضامین کا مجموعہ بھی۔

پروفیسر محسن عثمانی ندوی موجودہ دور کے معدودے چند قلم کاروں میں سے ایک ہیں جو بیک وقت اسلامی تعلیمات، قرآنی علوم اور دعوتِ اسلامی کے لیے کوشاں ہیں تو دوسری طرف تہذیبی آگہی، ثقافتی ورثہ اور ادبی پیچ وخم کے گیسو سنوارتے نظر آتے ہیں۔ ان کی زندگی کتابوں کے درمیاں گزری، سفر کے مشاہدات وتجربات بھی پیش کیے۔ ملت اسلامیہ ہندیہ کی زبوں حالی پر نوحہ خواں ہوئے تو عرب حکومتوں کے ظلم وتعدی اور دین بیزاری پر ان کا قلم تیغ براں کی طرح مستقل جواں مردی کے ساتھ باطل سے برسر پیکار رہا ہے۔ وظیفہ یاب ہونے کے باوجود قلم کا یہ رشتہ مضبوط ہے،''عمر گریزاں کے آخری پڑاؤ پر بھی قلم کا سفر جاری ہے۔''

پروفیسر محسن عثمانی ندوی کی مرصع نثر کے نمونے پر مضمون کا اختتام ہوتا ہے کہ'' شام باعث عطر بیزی مشام ہے۔ شام مرکز خوبانِ گل اندام ہے۔ شام رونق صبح وشام ہے، شام اس دنیا کا جلوۂ بام ہے۔ شام پسند حضرت خیر الا نام ہے، شام بزبان رسالت کنانۃ الاسلام ہے، شام سب کے لیے باعث احترام ہے، اس تعریف میں کوئی مبالغہ نہیں ہے۔ زبان رسالت نے فرمایا تھا طوبیٰ للشام یعنی خوشا سرزمین شام۔ (ص 117)

☆ مبصر سے رابطہ: شعبہ عربی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی-25
Mobile: 8002850400

□□□

'اردو بک ریویو' کی اشاعت (نومبر 1995 تا 2025) کے الحمدللہ، اِکتیس (31) برس مکمل ہو چکے ہیں۔ یہ دستاویزی مجلّہ آپ کے خصوصی تعاون کا منتظر ہے۔ مالی بحران سے نکلنے میں ہماری مدد فرمائیں۔ (ادارہ)

ڈاکٹر زہرہ خاتون
(شعبہ فارسی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی)
کی ایک تازہ کتاب
ہندوَ ایران کے لسانی رشتے
(مجموعہ مقالات)
صفحات: 312 قیمت:-/400 اشاعت:2026
ISBN 978-93-90579-67-9
رابطہ: اردو بک ریویو، دریا گنج، نئی دہلی۔
Mobile: 9953630788

تعمیرِ شخصیت: کامیاب زندگی کا فارمولا

مصنف: مولانا وحیدالدین خاں

تبصرہ: محمد عارف اقبال

ماہنامہ 'الرسالہ' کے بانی ایڈیٹر محترم وحیدالدین خاں (پ: یکم جنوری 1925) کی شناخت ابتدا سے اسلامی مرکز نئی دہلی کے مؤسس اور ماہنامہ 'الرسالہ' ہی رہا۔ اس رسالہ کے ذریعے انہوں نے اپنے مشاہدات، خیالات، وارداتِ قلبی، اسفار اور تجربات وغیرہ کو دلنشیں انداز میں بیان کرکے اپنے قارئین اور مداحوں سے خراجِ تحسین وصول کیا ہے۔ اس رسالہ کے ذریعے خاں صاحب کا حلقہ رفتہ رفتہ اس قدر وسیع ہوگیا کہ 1980 کے بعد عوام بالخصوص خواص کے طبقے میں ان کے دانشورانہ ومفکرانہ خیالات پر مباحثہ ہونے لگا۔ نئی نسل کے علم میں شاید نہ ہو کہ خاں صاحب کا تعلق جماعت اسلامی سے رہا ہے۔ وہ 1956 میں جماعت اسلامی ہند کے شعبہ تصنیف وتالیف سے وابستہ ہوئے۔ لیکن ان کے بعض خیالات سے جب جماعت اسلامی کے حلقے میں ان پر سخت تنقید ہونے لگی تو جماعت اسلامی سے 1963 میں الگ ہونے کے بعد ندوۃ العلما لکھنؤ کی مجلس تحقیقات ونشریات سے منسلک ہوئے۔ اس کے بعد 1967 میں الجمعیۃ ویکلی کے مدیر مقرر ہوئے۔ لیکن موصوف کو کسی بھی کام سے اطمینانِ قلب حاصل نہ ہوسکا۔ چنانچہ 'اسلامی مرکز' کے قیام کے ساتھ انہوں نے عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر کی تصنیف و اشاعت کا آغاز کردیا۔ مسلمانوں کی ذہنی وفکری اصلاح اور ان کے اندر قرآن وسنت کی روشنی میں مثبت تعمیری اور فکری شعور بیدار کرنے کے لیے 1976 میں ماہنامہ 'الرسالہ' کا اجرا کیا جس نے غیرمعمولی مقبولیت حاصل کی۔

وحیدالدین خاں صاحب کا مشاہدہ مفکرانہ اور دانشورانہ تھا۔ وہ ایک عام واقعہ کو بھی دانشورانہ رنگ دینے کا ہنر رکھتے تھے۔ جس واقعہ میں عام آدمی کے لیے کوئی کشش یا سامانِ عبرت نہ ہو، خاں صاحب اسے الرسالہ میں پُرکشش لیکن سادہ اسلوب میں پیش کردیتے تھے۔ اس واقعہ سے وہ مفکرانہ نتیجہ اخذ کرتے تھے۔ ماہنامہ الرسالہ کے ہزاروں صفحات میں ایسے واقعات بکھرے ہوئے ہیں۔ اسی طرح جب انہوں نے دعوتی اسفار شروع کیے تو اپنے سفرنامہ کی روداد 'الرسالہ' میں بڑے دلچسپ انداز میں لکھا کرتے تھے۔ ان کے اندر ایک عجیب قسم کی سیمابی کیفیت تھی جس کی وجہ سے وہ اضطراب میں مبتلا رہتے تھے۔ یہ اضطراب ہی درحقیقت ان کو تذکیر واصلاح کی طرف مائل رکھتا تھا۔ ان کے تذکیر اور اصلاح کا انداز انوکھا تھا اور ہر بات کو ایک اسٹوری (Story) بناکر پیش کرنے میں وہ مہارت رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ 'الرسالہ' کے ذریعے ان کے قارئین میں مسلسل اضافہ ہی ہوتا رہا۔ بعد میں اس کا ہندی اور انگریزی ایڈیشن بھی نکلنے لگا۔ جب 2001 میں عالمی سطح پر امن کے قیام اور روحانیات کے فروغ کے لیے CPS کا قیام عمل میں آیا تو اس سے اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ (مسلم وغیرمسلم دونوں) تک خدا کے ابدی پیغام کو پہنچانے کا فریضہ انجام دینے لگے۔ 'اسلامی مرکز' میں روحانی کلاس (Spritual Class) کا اہتمام بھی ہونے لگا۔ خاں صاحب نے اپنے دعوتی مشن کے لیے نصف درجن سے زائد براعظم کا سفر کیا۔ ان کے بعض ملی اور بین الاقوامی ایشوز اور نظریاتی اختلاف کے سبب برِّعظیم میں اگرچہ شدید تنازعات نے جنم لیا لیکن وہ اپنے مشن کو آگے بڑھانے میں تاحیات سنجیدگی کے ساتھ مصروف رہے۔ بعض تاریخی شخصیات کی خدمات پر غیرضروری تنقید وتبصرے نے بھی خاں صاحب کی شبیہ کو دھندلا کیا تھا۔ بالآخر 21 اپریل 2021 کو وہ اس جہانِ فانی سے رخصت ہوگئے۔ تقریباً دوسو کتابوں کے مصنف کا دعوتی مشن اب بھی جاری ہے اور ان کی کتابیں شائع کرنے کی کوشش ان کے ورثا کی طرف سے کی جارہی ہے۔ ان کی تازہ کتابوں میں یہ صراحت بھی موجود ہے کہ اس کا کاپی رائٹ محفوظ نہیں ہے، یعنی کوئی بھی شائع کرسکتا ہے۔

'تعمیر شخصیت' کا پہلا ایڈیشن وحیدالدین خاں صاحب کے انتقال کے تقریباً دوسال بعد (2023) شائع ہوا تھا۔ زیرنظر

صفحات: 496   قیمت: درج نہیں   تیسرا ایڈیشن: 2026
ناشر: Goodword Books, A-21, Sector-4
Noida - 201301 (NCR) Mob: 8588822672
E-mail: info@goodwordbooks.com

کتاب کا یہ ایڈیشن 2026 میں منظر عام پر آیا ہے۔ اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ماہنامہ 'الرسالہ' سے خاں صاحب کی تحریروں کو منتخب کر کے مرتب کیا گیا ہے۔ کتاب میں اگرچہ مرتب کا نام نہیں ہے لیکن مقدمہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کام خان صاحب کی صاحبزادی ڈاکٹر فریدہ خانم کی نگرانی میں انجام دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر خانم نے اپنے 'مقدمہ' میں ایک امریکن رائٹر رابرٹ گرین (پ:1959) کی کتاب 'The Laws of Human Nature' کا ایک اقتباس نقل کیا ہے۔ اس کی روشنی میں موصوفہ لکھتی ہیں کہ حقیقی انسان وہ نہیں ہے جو ظاہر میں اچھا ہو، مگر باطن میں بُرا ہو۔ حقیقی انسان وہ ہے جس کا باطن اس کے ظاہر سے بہتر ہے۔ وہ ڈبل اسٹینڈرڈ کا حامل انسان نہ ہو۔ کیونکہ ڈبل اسٹینڈرڈ ہی کا مذہبی نام منافقت ہے۔

'مقدمہ' کے بعد 'تعمیر شخصیت' کے تحت قرآن و حدیث کی روشنی میں سات عنوان کو کتاب کی اساس کا درجہ دیا گیا ہے۔ یہ عنوانات ہیں: انسان کی شخصیت، شخصیت کی تعمیر، کنڈیشننگ کا عمل، زندگی کی تعمیر، تعمیر خویش کا طریقہ، مومن کا کنسرن، اپنی تعمیر آپ۔ پھر کتاب کو چار بڑے ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ابواب اس طرح ہیں: شکر ایک عظیم عبادت، صبر دین کا خلاصہ، اعراض اور رواداری، مثبت سوچ — منفی سوچ۔ کتاب کے اختتام پر تعمیر شخصیت کے راز کو کھولتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ ''جو شخص یا قوم خدا کی اسکیم آف تھنگس (Scheme of things) سے مطابقت کرے گا، وہ کامیاب ہوگا اور جو اس سے مطابقت نہیں کرے گا وہ ناکام ہو کر رہے گا۔'' آخر میں کامیابی کے دس اصول خاں صاحب نے ایک امریکی تاجر (Byrd Baggett) کی لکھی ہوئی کتاب سے اخذ کیے ہیں۔ 'The Book of Excellence' کے 236 چھوٹے چھوٹے جملوں سے خاں صاحب نے دس نکاتی اصول خود مرتب کیے ہیں۔ دس نکات کا پہلا اصول ہے ''ایک بُرا رویہ تمام دوسری خوبیوں پر پانی پھیر دیتا ہے۔'' (A bad attitude cancels all other positive skills)۔ دسواں اصول اس طرح بیان کیا گیا ہے ''ٹھہرو، سنو، اور جواب دینے سے پہلے غور کرو۔'' (Stop, listen, and think before you respond)۔ خاں صاحب لکھتے ہیں کہ یہ اقوال اُس فطری حکمت کو بیان کرتے ہیں جن کو اختیار کر کے کوئی شخص دنیا میں اپنی کامیابی کو یقینی بنا سکتا ہے۔ یہ اقوال کامیابی کی کنجی ہیں۔ کامیابی کے یہ دس اقوال کا انگریزی ترجمہ بھی کتاب میں شامل ہے۔ کامیابی کے یہ اصول اگرچہ تاجرانہ نکتہ نظر سے لکھے گئے ہیں لیکن اس کے مطالعہ اور مثبت نتیجہ اخذ کرنے سے شخصیت کی تعمیر میں انقلابی تبدیلی ہوسکتی ہے۔

وحیدالدین خاں صاحب کا ادبی اسلوب سادہ اور دلنشیں ہوتا ہے۔ اپنی تحریروں میں جابجا وہ انگریزی الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ یہ وہ الفاظ ہیں جو عام بول چال میں معروف ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ انہوں نے نئی نسل کی تہذیبی و تعلیمی تربیت پر خاص توجہ مرکوز رکھی ہے۔ واضح ہو کہ اردو زبان اپنے اندر دیگر زبانوں کے الفاظ کو سمونے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہے۔ مثلاً 'تھرمامیٹر' کو اب کوئی بھی 'مقیاس الحرارت' نہیں کہتا ہے۔ خاں صاحب نے اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ موجودہ نئی نسل میں زبان کی ترسیل آسان ہو۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں کے مداحوں میں نوجوانوں کی اکثریت ہے۔ خاں صاحب لکھتے ہیں ''ایک مومن کا سب سے بڑا کنسرن (Concern) یہ ہوتا ہے کہ آخرت میں اس کو جنت میں داخلہ ملے۔'' (صفحہ 16) جدید تعلیم یافتہ نئی نسل کے لیے Concern ایک عام لفظ ہے جسے وہ خوب بولتی ہے اور مفہوم کو سمجھتی ہے۔ اسی طرح موجودہ دور کی اصطلاح کو خاں صاحب 'صبر کا فلسفہ' کے عنوان سے کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

''تاریخ بتاتی ہے کہ دنیا کے تمام پیسفسٹ (pacifist) یا پیس فل ایکٹیوسٹ (peaceful activist) اپنے نشانے کو حاصل کرنے میں ناکام رہے۔ اس کا مشترک سبب یہ ہے کہ انہوں نے امن کو دریافت کیا مگر وہ صبر کو دریافت نہ کر سکے۔''

(صفحہ 151)

خاں صاحب کی تحریروں کی دوسری بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ثقیل اردو لفظ کو لکھ کر قوسین میں اس کا انگریزی ترجمہ بھی دے دیتے ہیں تاکہ نئی نسل کے لیے اردو لفظ کو سمجھنے میں دشواری نہ ہو۔ مثلاً ''یہ زمانہ گویا موبائل انفجار (mobile

(explosion) کا ہے۔'' دوسرا جملہ دیکھیے: ''سائنسی ریسرچ سے معلوم ہوا ہے کہ انسان کی زبان میں تقریباً دس ہزار ذائقہ خانے (taste buds) ہیں۔''

علما اور دانشور بہت سے معاملات میں وحیدالدین خاں صاحب سے اختلاف کرسکتے ہیں، ممکن ہے کہ بعض معاملات میں وہ حق بجانب بھی ہوں، لیکن خان صاحب نے ایک عام انسان کو زندگی جینے کا جو سلیقہ اپنی تحریروں میں پیش کردیا ہے، اس کی صداقت سے انکار ممکن نہیں۔ زیرنظر کتاب میں جن عنوانات پر خاں صاحب نے مفکرانہ و دانشورانہ اظہار خیال کیا ہے وہ باتیں ہر شخص بالخصوص مومن کی زندگی کے لیے انتہائی قیمتی اور تعمیر شخصیت کی جڑوں کو فرٹیلائز (fertilize) کرنے میں بے حد معاون ہیں۔ یہ کتاب ہر گھر کی ضرورت ہے اور ہر طالب علم کے لیے ناگزیر ہے۔ اس کتاب میں خاں صاحب نے اپنے اسفار کے مشاہدات اور تجربات سے بھی قارئین کو مستفید کرنے کی کوشش کی ہے۔

□□□

مولانا ابوالکلام آزاد

مصنف: سہیل انجم

تبصرہ: پروفیسر محمد سلیم قدوائی☆

مولانا ابوالکلام آزاد نے مذہب، ادب، صحافت اور سیاست کے شعبوں میں جو نقوش ثبت کیے ہیں وہ ناقابل فراموش ہیں۔ ان کی ہمہ جہت شخصیت پر کثرت سے لکھا گیا اور برابر لکھا جارہا ہے۔ ان کے افکار اور نظریات کی اہمیت و معنویت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کی شخصیت اور خدمات کا مطالعہ وہاں بھی ہورہا ہے جہاں کبھی ان کا نام لینا بھی جرم سمجھا جاتا تھا یعنی پاکستان میں۔ اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ مولانا آزاد کے بارے میں جتنا غلط پروپیگنڈہ کیا گیا اور

صفحات: 132 قیمت:-/160 اشاعت:2026
ISBN 978-81-989656-1-5
ناشر: قاضی پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز، B-35 نظام الدین (W)، نئی دہلی-110013 موبائل:9315177399

جتنی غلط فہمیاں پھیلائی گئیں اتنی شاید ہی کسی اور شخصیت کے بارے میں پھیلائی گئی ہوں۔

زیرتبصرہ کتاب معروف صحافی اور ادیب سہیل انجم کے مختلف مواقع پر لکھے گئے مضامین کا مجموعہ ہے جو ایسے وقت میں منظرعام پر آیا ہے جب مجاہدین آزادی اور خاص طور سے مسلم مجاہدین اور رہنماؤں کو مکمل طور پر نظرانداز کرنے کی مہم چلائی جارہی ہے۔ کتاب کے آغاز میں شیخ صلاح الدین مقبول، پروفیسر محسن عثمانی ندوی اور مفتی عطاءالرحمٰن قاسمی نے اپنے مضامین میں کتاب پر اظہار خیال کیا ہے جو تبصرہ نگار کی رائے میں قطعی غیرضروری ہیں کیونکہ سہیل انجم ادب وصحافت کی دنیا میں اپنا مقام بنانے میں کامیاب ہوچکے ہیں۔ آخری مضمون پروفیسر نثاراحمد فاروقی کا ہے جو ایک ریڈیائی تحریر ہے جو کتاب پر نہیں بلکہ مولانا آزاد کی شخصیت پر ہے۔ یہ تو بالکل ہی غیرضروری ہے اس لیے کہ آزاد کی شخصیت اور کارناموں سے انصاف کرنے کے لیے سہیل انجم کی تحریریں کافی ہیں۔

مولانا آزاد جیسی عبقری شخصیت کے تمام پہلوؤں کا احاطہ تو ضخیم سے ضخیم کتاب یا تحقیقی مقالہ بھی نہیں کرسکتے لیکن اس مختصر کتاب میں آزاد کے علمی، سیاسی، صحافتی اور ادبی خدمات اور کارناموں کو نہایت جامع انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں پاکستان کے بارے میں آزاد کے خدشات خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ مولانا آزاد نے جہاں دوقومی نظریہ کی مخالفت کی تھی وہاں تقسیم وطن کی بھی شدت سے مخالفت کی تھی۔ وہ شروع سے ہی اپنی تقریروں اور تحریروں کے ذریعہ تقسیم ہند کے خطرناک اور بھیانک نتائج سے آگاہ کرتے رہے۔ ان کی اوّلین کوشش ہندوستان کی وحدت کو قائم رکھنا تھا۔ انہوں نے متعدد بار کہا کہ آزادی کو موخر کردو لیکن ملک کی تقسیم منظور نہ کرو۔ اس سے ایسا نقصان ہوگا جو نسلوں میں پورا نہ ہوسکے گا۔ ان کا کہنا تھا کہ ایک وقت ایسا آئے گا جب تقسیم وطن کے حامی اپنی غیر دانش مندانہ فعل پر شرمندہ ہوں گے لیکن اس وقت ندامت سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ بدقسمتی سے ان کے خاص رفقا بھی تقسیم کے حق میں ہوگئے اور وہ تنہا رہ گئے۔ تقسیم سے ملک کو اور خاص طور سے مسلمانوں کو جو شدید نقصان پہنچا اس کا اندازہ آزاد

سے بہتر کوئی نہ لگا سکا۔ وقت اور تاریخ نے ثابت کر دیا کہ اگر مولانا آزاد کا موقف تسلیم کر لیا گیا ہوتا اور پاکستان نہ بنتا تو یہ مسلمانوں کے حق میں بھی بہتر ہوتا اور برصغیر کے حق میں بھی بہتر ہوتا۔

اس کتاب میں ایک اہم مضمون مولانا آزاد کی ایک انوکھی سوانح ہے جس کو ممتاز ادیب مولانا محمد اسحاق بھٹی نے لکھا ہے۔ اس کتاب سے مولانا آزاد اور علامہ اقبال کے باہمی تعلقات کا پتہ چلتا ہے۔ عام تاثر کے مطابق دونوں کو ایک دوسرے کا مخالف سمجھا اور مانا جاتا ہے اور اس کے ثبوت میں یہ کہا جاتا ہے کہ مولانا آزاد نے اپنی کتابوں میں اقبال کا کوئی شعر درج نہیں کیا۔لیکن مصنف کی تحقیق کے مطابق غبار خاطر میں اقبال کا شعر درج ہے۔ اس کے علاوہ دونوں کے درمیان کثرت سے خط و کتابت ہوتی تھی۔ اقبال اہم معاملات کے سلسلے میں آزاد کی رائے دریافت کرتے تھے، ان کی تصانیف کا مطالعہ کرتے تھے اور اپنی تصانیف ان کو بھجواتے تھے۔ دوسری طرف آزاد، اقبال کے شاعرانہ کمالات اور فلسفہ وحکمت کے قائل تھے اور ان کو ملک الشعرا کا خطاب دینے کی تجویز پیش کرتے تھے۔ اس بات کا ذکر (مولانا) عبدالرزاق ملیح آبادی نے بھی اپنی کتاب میں کیا ہے۔ اس کے علاوہ آزاد کے اخبار البلاغ کے پہلے صفحہ پر اقبال کا کلام شائع ہوتا تھا۔ اقبال کی وفات پر اپنے بیان میں آزاد نے گہرے رنج وغم کا اظہار کیا تھا۔ ان تمام باتوں کی تائید میں سہیل انجم ثبوت بھی فراہم کرتے ہیں۔

مولانا آزاد ایک صاحب طرز ادیب تھے۔ ادب کے شعبے میں ان کے کمالات کا اعتراف انہوں نے دو مضامین ''مولانا آزاد کی خودنوشت 'تذکرہ' کا تذکرہ'' اور ''غبار خاطر ایک ادبی شہ پارہ'' کے ذریعہ کیا ہے۔ ان مضامین کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ سہیل انجم نے مولانا آزاد کی تحریروں کا گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔ ادب اور انشاپرداز ہونے کے ساتھ ساتھ مولانا آزاد ایک بلند پایہ صحافی بھی تھے۔ صحافت کے میدان میں ان کے کارناموں کا ذکر دو مضامین 'مولانا آزاد کی صحافتی خدمات پر ایک نظر' اور 'الہلال والبلاغ کی اشاعتوں کا تعارف' کے ذریعہ بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ چاروں مضامین عمدہ اور معلوماتی ہیں۔

سہیل انجم کے یہ مضامین نہ صرف مولانا آزاد کی شخصیت، فکر اور کارناموں پر روشنی ڈالتے ہیں بلکہ ان کے متعلق غلط بیانیوں کا ردّ، ازالہ اور دفاع بھی کرتے ہیں۔ بلا شبہ یہ ایسی تحریریں ہیں جن سے آزاد کے مقام و حیثیت اور ان کے امتیازات کو سمجھا جاسکتا ہے۔ یہ کتاب ان کی شخصیت کے اہم پہلوؤں کو نمایاں کرنے کے علاوہ ان کی اہمیت ومعنویت کو اجاگر کرتی ہے۔ مولانا آزاد کی شخصیت وکردار اور ان کے افکار اور نظریات کا مطالعہ سہیل انجم کا پسندیدہ مشغلہ رہا ہے اور یہ کتاب اس حقیقت کی واضح نشاندہی کرتی ہے۔ اس کتاب میں شامل تمام تحریریں آزاد کی خدمات اور مختلف شعبوں میں ان کے رول کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوں گی۔ آزاد سے متعلق معلومات کا ایک وقیع سرمایہ اب تک سامنے آ گیا ہے جو 'ابوالکلامیات' کے عنوان سے موسوم ہے۔ سہیل انجم کی کتاب اس ذخیرے میں ایک قیمتی اضافہ ہے۔ یہ کتاب آزاد سے دلچسپی رکھنے والوں (بشمول تبصرہ نگار) کے لیے ایک قابل قدر تحفہ ہے جس کے لیے مصنف مبارکباد کے مستحق ہیں۔ کتاب نہایت خوبصورت چھپی ہے اور سرورق دیدہ زیب ہے۔ قیمت بھی مناسب ہے۔

☆ مبصر کا پتہ: C-501، روز وڈس اپارٹمنٹ، میور وہار ا،
نئی دہلی-110091 Mobile: 9953529424
E-mail: mskidwai@hotmail.com

□□□

ابرار فائق: ایک قلندر مزاج شاعر

مرتب: پروفیسر محمد نعیم فلاحی

تبصرہ: سعید اختر اعظمی☆

''ابرار فائق اپنی شاعری میں قلندر کی اصطلاح واضح طور پر استعمال نہیں کرتے ،لیکن ان کا فلسفہ اور عالمی نظریہ ایک بےفکر آوارہ کے صوفی آئیڈیل کے ساتھ مضبوطی سے گونجتا

صفحات: 176 قیمت:-/300 اشاعت:2026
ISBN 978-93-90579-59-4
ناشر: القاسم پبلی کیشنز، سوائی مادھوپور-322001 (راجستھان)
دہلی میں ملنے کا پتہ: اردو بک ریویو۔ موبائل:9953630788

ہے۔صوفی روایت میں قلندر ایک ایسی شخصیت ہے جو دنیاوی وابستگیوں کو ترک کر کے سادگی اور لاتعلقی کی زندگی کے ذریعے روحانی روشن خیالی کی تلاش میں ہے۔فائق کا قلندری نقطہ نظر اسے دنیا کو لاتعلقی مزاج اور روحانی بصیرت کے ساتھ دیکھنے کی اجازت دیتا ہے۔ان کی شاعری زندگی کی عارضی نوعیت اور روحانی نشوونما کی اہمیت کی گہری تفہیم کی عکاسی کرتی ہے۔ اپنے قلندری عینک کے ذریعے فائق محبت،نقصان اور معنی کے موضوعات کو تلاش کرتے ہیں۔'' ایم مبین کی یہ رائے موصوف کے قلندرانہ وژن کی عکاس ہے۔پروفیسر توقیر احمد خاں اس کی تائید یوں کرتے ہیں: ''ابرار فائق کی شاعری میں دوسرا پیکر درویش یا قلندر کا پیکر ہے۔ اس پیکر کے سہارے فائق نے دنیا میں پیدا شدہ تمام مسائل کا حل ڈھونڈ لیا ہے۔'' ڈاکٹر محمد اشتیاق احمد بھی تسلیم کرتے ہیں کہ''ابرار فائق کے ذہن پر مذہبی روایات اور عشق کے متصوفانہ تصور کا گہرا اثر ہے۔'' درج ذیل اشعار اس حوالے کو معتبر کرتے ہیں:

یہ اہل دل کا قبیلہ تھا،سب قلندر تھے
انا بچائے رہے ،التجا کسی نے بھی نہ کی

....

قلندروں کے لیے دل کی سلطنت ہے بہت
نہ شہرتیں دے ، نہ زر دے ، نہ مال دے مولا

....

ہمیں دیا ہے خدا نے قلندری کا مزاج
ہے ٹھوکروں میں یہ جاہ وحشم ہمارے لیے

....

بدل نہ جائے مزاج قلندری میرا
یہ عیش وعشرت دنیا لبھا رہے ہیں بہت

....

ہم قلندر ہیں ،فقیروں میں بہت بیٹھے ہیں
کیا اثر رکھتا ہے اک حرف دعا جانتے ہیں

یہ تنوع رنگ پہلو'قلندرانہ مزاج' کا آئینہ دار ہیں جو ابرار فائق کی شخصیت وشاعری کا جزو لازم بن چکے ہیں۔ پروفیسر محمد نعیم فلاحی کی مرتب کردہ'ابرار فائق :ایک قلندر مزاج شاعر' موصوف کے فکر وفن کا اجمالی جائزہ ہے۔ یہاں قلندرانہ پہلوؤں کے ساتھ دیگر رویوں پر بھی سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے جو اُن کے عصری لہجے،صلابت فکر، واردات دل،محبت، کرب وحوصلہ،حساسیت، مفکرانہ زیروبم،تعمیری رجحان،توانا اظہار اور فکری وفنی ابعاد کی نمائندگی کرتی ہیں۔ پروفیسر منظر حسین، پروفیسر عبدالحق، پروفیسر ابن کنول، پروفیسر سید فضل امام رضوی، پروفیسر خواجہ اکرام الدین، پروفیسر احتشام اختر، پروفیسر محمد کاظم،ڈاکٹر عزیزاللہ شیرانی، ڈاکٹر محمد حسین،ڈاکٹر اعظم بیگ، ڈاکٹر مصور احمد، ڈاکٹر ذکی طارق،ڈاکٹر محمد نجم الدین،ڈاکٹر محمد وسیم رضا،ڈاکٹر محمد اشتیاق احمد،ڈاکٹر تابش مہدی،ڈاکٹر آفاق فاخری ، نذیر فتح پوری،منور رانا اور دیگر کی تحریریں صاحب فن کی سخن وری کی جہتوں پر بھرپور روشنی ڈالتی ہیں۔

ابرار فائق (ابرار احمد، ولادت 1957) ابتدا میں درس و تدریس سے وابستہ رہے۔ بعدازاں بی ڈی او،ایس ڈی ایم، سی ای او،کمشنر نگر نگم کے عہدے پر فائز ہوئے۔اس دوران قرطاس وقلم سے ان کا رشتہ مستحکم سے مستحکم تر ہوتا گیا جس کے نتیجے میں8 شعری مجموعے(کنج قفس2010، اعراف 2012، محشر 2013، میزان 2014، اضطراب 2014، کوثر 2015، فردوس 2016،نجات 2016) کے شانہ بہ شانہ قرآنیات وسیرت (نقوش کف پائے مصطفیٰ 2017،فہم قرآن 2019،سیدالبشر، کائنات گواہ ہے، اوراقِ حکمت، تذکیر) کے مطالعات بھی سامنے آئے۔نثر ونظم کا یہ تخلیقی سفر اپنی آب وتاب سے ہنوز جاری وساری ہے۔ اس کتاب میں شامل تحریروں کے اہم اقتباس پر بھی نظر ڈال لیتے ہیں جس سے موصوف کی تخلیقی جہت نمایاں ہوتی ہے۔

''ابرار احمد فائق کی غزلیں فنکار کے آفاقی ویژن اور جذبہ وفکر کی ترجمان ہیں جن میں تہ داری بھی ہے، داخلیت اور فنی نظم وضبط بھی''۔(ص6)

''انھوں نے کلاسیکی شاعری کی لفظیات واستعارات کو بخوبی استعمال کیا اور اس کے مضامین کو بہتر انداز سے باندھا ہے۔'' (ص14)

''ان کی نظمیں صرف کاغذ پر قلم کی سیاہی کا بوجھ نہیں ہیں بلکہ

ان میں زندگی شاعری کی بھرپور رمق موجود ہے۔'' (ص21)

''فائق کی دنیا ان کے جذب دروں سے آباد ہے۔'' (ص23)

''اردو ان کا ذریعہ معاش نہیں، لیکن وہ اردو سے عشق کرتے ہیں۔'' (ص25)

''ابرار احمد فائق میرے قریہ دل میں کم وبیش تین دہائیوں سے خیمہ زن ہیں۔ ان کی غزلوں میں لہجے کا اچھوتا پن بھی ہے اور موضوع کا تنوع بھی۔'' (ص28)

''ان کا جمالیاتی شعور بھی غزل کی آب وتاب کو فکر جمیل سے ہم کنار کیے ہوئے ہے۔'' (ص33)

''ان کے اشعار میں عصری مسائل کے ساتھ ساتھ شعور ذات بھی اپنے وجود کا احساس دلاتا ہے۔'' (ص45)

''ان کی باتیں دل سے نکلتی ہیں اور دل میں اتر جاتی ہیں۔'' (ص47)

''ان کے یہاں غم دوراں اور غم جاناں ایک ہوجاتا ہے۔'' (ص53)

''ان کے طرز اظہار اور اسلوب بیان میں توازن اور اعتدال ہے۔ دراصل یہی تو اچھی، سچی اور زندہ شاعری کی علامت ہے۔'' (ص71)

''فائق نے اپنی غزلوں میں ادب برائے ادب کی بجائے ادب برائے زندگی کے نقطہ نظر کو اصل مقصد بنایا ہے۔'' (ص131)

رسم اختتامیہ نبھاتے ہوئے ابرار فائق کے چند اشعار سے لطف حاصل کیجیے جو اُن کے فکر وفن کی بھرپور نمائندگی کرتے ہیں۔

فائق ڈھلے ہے لفظ کے پیکر میں خون دل
احساس غم ہے، پیشہ نہیں شاعری مجھے

....

شعور ذات کو خون جگر سے سینچا ہے
یہاں پہنچنے میں فائق ہمیں زمانے لگے

....

غزل کے لہجے میں کہنی ہے دل کی بات مجھے
مرے خدا مرے الفاظ کو زباں مل جائے

....

آتی ہے شاعری میں بہت تجربے کے بعد
جو ہے خیال وفن کی نزاکت ہمارے پاس

....

ہم اپنے درد کو لکھتے ہیں دل کے کاغذ پر
قلم جنوں سے، جگر سے سیاہی مانگتے ہیں

....

تصنع جس میں ہو فائق وہ فن زندہ نہیں رہتا
غزل لکھتے ہیں خون دل سے، لفاظی نہیں کرتے

....

فائق خدا سے رات کی تنہائیوں میں مانگ
دل کے ثبات، جرات نوک قلم کی بھیک

☆ مبصر سے رابطہ: ریاض (سعودی عرب)
Mobile: +966598300320

❑❑❑

سندیلہ کے مشاہیر شعرا

مصنف: ڈاکٹر سعید احمد سندیلوی

تبصرہ: ڈاکٹر شاہد حبیب☆

اردو ادب کی تاریخ میں ایسے تحقیقی اور تذکرہ جاتی کام ہمیشہ خصوصی اہمیت رکھتے ہیں جو کسی مخصوص خطے، شہر یا قصبے کے شعری و ادبی سرمائے کو محفوظ کر کے آنے والی نسلوں تک پہنچائیں۔ برصغیر کی ادبی روایت میں دہلی، لکھنؤ، حیدرآباد، بھوپال اور لاہور جیسے مراکز کے ادبی منظرنامے پر تو سینکڑوں کتابیں موجود ہیں، لیکن نسبتاً چھوٹے قصبوں اور علاقوں کی ادبی تاریخ پر تحقیقی کام بہت کم ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کسی محقق کی توجہ ایسے قصبے کی طرف مبذول ہوتی ہے جس نے صدیوں سے علمی وادبی خدمات انجام دی ہوں، تو اس کا کام ایک قیمتی اور نادر حوالہ بن جاتا ہے۔ ڈاکٹر سعید احمد سندیلوی کی کتاب 'سندیلہ

صفحات: 352 قیمت: -/400 اشاعت: 2023
ناشر: مصنف، 435/330 رجب گنج، ٹھاکرگنج،
لکھنؤ-226003 (یوپی) موبائل: 9455551607

کے مشاہیر شعرا' اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ یہ کتاب اپنے موضوع کی جامعیت، تحقیقی گہرائی، اور حوالہ جاتی استناد کے سبب فوری طور پر سندیلہ کی علمی و شعری تاریخ کا بنیادی ماخذ بن گئی۔ مصنف نے نہ صرف شعرا کے حالاتِ زندگی اور ان کے شعری کارناموں کو قلم بند کیا ہے بلکہ سندیلہ کے تاریخی، جغرافیائی اور سماجی پس منظر کو بھی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس طرح یہ کتاب محض ایک تذکرہ نہیں بلکہ ایک مکمل تحقیقی و تنقیدی دستاویز بن گئی ہے جو مقامی تاریخ، ثقافت اور ادبی ماحول کو یکجا پیش کرتی ہے۔ کتاب کی اسی اہمیت کے پیش نظر فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی، حکومت اتر پردیش، لکھنؤ نے اس کی اشاعت کے لیے مالی تعاون پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر سعید احمد سندیلوی اردو تحقیق و تنقید کا معتبر نام ہے۔ موصوف مترجم، شاعر اور تنقید نگار بھی ہیں، لیکن ان کی اصل شناخت ایک محنتی اور باریک بین محقق کی حیثیت سے ہے۔ ان کا قلمی سفر مختلف اصناف پر محیط ہے۔ ان کی مطبوعہ کتب میں تراجم، تنقیدی مضامین، سوانح اور شعری مجموعے شامل ہیں۔ اس کتاب کی تیاری کا پس منظر خود مصنف نے مقدمے میں بیان کیا ہے کہ کانپور یونیورسٹی سے 1994 میں ایم اے (اردو) کرنے کے بعد لکھنؤ یونیورسٹی سے پی ایچ – ڈی کا ارادہ کیا تو ان کے نگراں پروفیسر انیس اشفاق عابدی نے انہیں سندیلہ کے شعرا پر تحقیقی کام کرنے کا مشورہ دیا۔ انہوں نے اس مشورے کو حرزِ جاں بنایا اور سندیلہ کے تمام شعرا پر تحقیقی کام کا بیڑا اٹھایا۔ ظاہر ہے یہ کام محض علمی مشق نہیں بلکہ ایک عزم و حوصلے کی کہانی ہے۔ سندیلہ کی سرزمین برصغیر کی ادبی و تہذیبی تاریخ میں اپنی منفرد شناخت رکھتی ہے۔ اس قصبے میں اردو شاعری کا آغاز اگرچہ دیگر مراکزِ ادب کے مقابلے میں کچھ تاخیر سے ہوا، تاہم اس تاخیر کی وجہ واضح ہے۔ یہاں کے اہلِ علم صدیوں تک دینی علوم، فقہ، فلسفہ اور منطق کی طرف زیادہ مائل رہے اور شعر و شاعری کو محض تفریح کا وسیلہ سمجھتے تھے۔ لیکن جب اس سرزمین پر شعر و ادب کی ہوا چلی تو ایسی باسی نہ تھی؛ اس نے جلد ہی اپنے خوشبودار پھولوں اور نادر گوہروں سے اردو شاعری کے گلستان کو مالا مال کر دیا۔ نتیجتاً سندیلہ جیسے قصبے میں تین سو سے زائد شعرا گزرے ہیں، جن سب پر تحقیقی و تنقیدی جائزہ لینا ایک طویل اور کٹھن عمل تھا۔ مصنف نے اس چیلنج کو قبول کیا، مقامی اور قومی سطح کے ذرائع ابلاغ، لائبریریوں، اور نجی مجموعوں سے مواد حاصل کیا اور کئی برس کی محنت کے بعد یہ تحقیقی شاہکار ترتیب دیا۔ کتاب چھ ابواب، مقدمہ اور کتابیات پر مشتمل ہے۔ مصنف نے واضح اور منطقی تقسیم اختیار کی ہے، جس سے قاری کو سندیلہ کی ادبی تاریخ کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ تفصیل حسب ذیل ہے:

باب اول: سندیلہ کا تاریخی پس منظر — اس باب میں سندیلہ کی جغرافیائی حیثیت، قدیم تاریخ، مسلمانوں کی آمد اور سندیلہ کا وجہ تسمیہ سے متعلق مختلف آرا پیش کی گئی ہیں۔ تاریخی ماخذات اور مقامی روایات کا امتزاج بیانیے کو جاذبِ نظر بناتا ہے۔ مصنف نے اس امر کو نمایاں کیا ہے کہ کس طرح صدیوں کی علمی سرگرمیوں نے سندیلہ کو ایک ادبی مرکز میں بدل دیا۔

باب دوم: سندیلہ کی ادبی و شعری فضا — یہ باب سندیلہ کی علمی و ادبی روح کو بیان کرتا ہے۔ مدرسہ منصوریہ اور مدرسہ شوکت الاسلام جیسی علمی درسگاہوں، لائبریریوں، اور مقامی علما و صوفیا کی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مصنف بتاتے ہیں کہ دیگر مقامات کی طرح یہاں بھی ابتدا میں فارسی اور عربی زبان کو فوقیت حاصل تھی اور اردو شاعری نسبتاً دیر سے پروان چڑھی۔

باب سوم: قدیم شعرا (1909 تک) — یہ حصہ سندیلہ کے ابتدائی شعرا کا احاطہ کرتا ہے، جن میں مولوی محمد بخش شہید سندیلوی سرِفہرست ہیں۔ ان کے علاوہ حکیم (مولانا) سید فضل رسول واسطی، ریاض الدین امجد، میر محمد حسن شیفتہ، مولوی نیاز علی پریشاں، فضل حسین شاعر، میر منصب علی ہنر اور مقبول احمد محو جیسے نام شامل ہیں۔ ہر شاعر کی مختصر سوانح، شعری رجحانات اور منتخب کلام کے نمونے اس باب کو علمی حیثیت بخشتے ہیں۔ ڈاکٹر سعید احمد سندیلوی کے مطابق سندیلہ کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر کے طور پر مولوی محمد بخش شہید سندیلوی (1222ھ/ 1277ھ) کا نام آتا ہے۔ وہ شیخ ناسخ کے شاگرد اور سندیلہ کے رہنے والے تھے لیکن مستقل قیام لکھنؤ میں رکھتے تھے۔ خوش نویسی میں کمال حاصل تھا۔ ان کا سلسلہ نسب حضرت محمد بن ابوبکرؓ تک جا پہنچتا

تھا۔ طبیعت رنگین اور ذہن سلیم تھا۔ عاشقانہ رنگ ان کے کلام پر حاوی تھا۔ وہ رعایت لفظی اور مشکل زمینوں میں طبع آزمائی کے ماہر تھے۔ انہوں نے اودھ کے بادشاہ محمد علی شاہ کے دور کا زمانہ دیکھا۔ مشاعروں میں باقاعدہ شرکت کی اور قصائد، غزلیات، رباعیات اور تاریخ گوئی میں طبع آزمائی کی۔ اگرچہ سوز و گداز آپ کے کلام میں کم تھا، لیکن یہ اس عہد کے ذوق کی عکاسی تھی جس میں گل و بلبل کی داستانیں مقبول عام تھیں۔ (ص:32)

باب چہارم: متوسطین شعرا (1911 تا 1985) — یہ سندیلہ کی شاعری کا سنہرا دور ہے۔ اس میں سید التفات رسول ہاشمی سندیلوی کی خدمات کو خصوصی طور پر سراہا گیا ہے۔ اسی دور میں سید انور حسین آرزو لکھنوی کا مستقل قیام سندیلہ میں ہوا، جس نے ادبی ماحول کو جِلا بخشی اور ایک قافلہ شاگردان پیدا کیا۔ دیگر نمایاں ناموں میں سید حسن شائق، حکیم (مولانا) بادشاہ حسین رعنا، چودھری صابر علی صابر، مولوی محمد عبدالعلی شوق، (مولانا) محمد منظور احمد کوثر، عبدالوحید سلمانی، اور چودھری سید امیر حسن بسمل شامل ہیں۔

باب پنجم: موجودہ شعرا (1986 تا حال) — مصنف نے اس باب میں موجودہ دور کے شعرا کو دو زمروں میں تقسیم کیا ہے: مرحومین اور حیات شعرا۔ مرحومین میں مختار احمد نظر، قاضی غلام صابر قدیری، محمد اطہر نفیس، ڈاکٹر عبدالسلام سلام، پروفیسر سید نورالحسن ہاشمی، صغیر احمد سحر، سید محفوظ رسول لائق، شیخ غلام مسکین ادب اور معین الدین احمد زخمی شامل ہیں۔ حیات شعرا میں چودھری ضیاء الدین ضیاء فاروقی اور ڈاکٹر زبیر احمد صدیقی جیسے نام آج بھی سندیلہ کی ادبی روایت کو آگے بڑھا رہے ہیں۔ سندیلہ سے باہر بھی اس بستی کے شعری نمائندے موجود ہیں، جنہوں نے مختلف شہروں میں رہتے ہوئے سندیلہ کی ادبی روایت کو آگے بڑھایا۔ ان میں بیدل سندیلوی (بنارس)، کشش سندیلوی (بارہ بنکی)، تمیس الحسن شمس سندیلوی (لکھنؤ)، حافظ عمر سندیلوی، رحمانی سندیلوی، اور حاجی مشتاق احمد مشتاق سندیلوی (شاہجہاں پور) شامل ہیں۔

باب ششم: مجموعی محاکمہ — یہ باب کتاب کا خلاصہ ہے، جہاں مصنف نے تمام ادوار کے شعرا کا تقابلی جائزہ پیش کیا ہے۔ ادبی معیار، فنی پختگی، اور موضوعاتی تنوع کا تجزیہ کرتے ہوئے مصنف نے سندیلہ کی ادبی حیثیت اور مستقبل کے امکانات پر روشنی ڈالی ہے۔

کتاب کے تجزیے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ سندیلہ کی ادبی روایت ایک تدریجی ارتقاء کا نتیجہ ہے۔ ابتدا میں دینی اور فکری علوم کا غلبہ رہا، پھر رفتہ رفتہ شاعری نے جگہ بنائی، اور بیسویں صدی میں یہ روایت اپنے عروج پر پہنچی۔ سندیلہ کے شعرا نے محض جمالیاتی اظہار تک خود کو محدود نہیں رکھا بلکہ مزاحمتی، اصلاحی اور فکری موضوعات پر بھی قلم اٹھایا۔ مولوی محمد بخش شہید کے عاشقانہ رنگ سے لے کر آرزو لکھنوی کے کلاسیکی اسلوب اور پھر موجودہ دور کے عصری شعور سے لبریز کلام تک، یہ سفر زبان و بیان کی وسعت اور فکری بلوغت کی کہانی سناتا ہے۔

ڈاکٹر سعید احمد سندیلوی کی زیر نظر کتاب 'سندیلہ کے مشاہیر شعرا' ایک ایسی تصنیف ہے جو تحقیق، تنقید اور ادبی تاریخ کے تینوں پہلوؤں کو کامیابی سے یکجا کرتی ہے، جو کہ نہ صرف سندیلہ بلکہ برعظیم کے دیگر چھوٹے شہروں اور قصبات کی ادبی تاریخ کے بعض حصوں کو محفوظ کرنے کی ایک شاندار مثال ہے اور طلبا، محققین اور ادبی شائقین کے لیے اس حوالے سے ایک بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے مطالعے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اردو ادب کا سرمایہ صرف بڑے مراکز تک محدود نہیں بلکہ چھوٹے قصبوں میں بھی تخلیقی جوہر موجود ہیں۔ یہ کتاب سندیلہ کی شعری روایت کو آئندہ نسلوں تک منتقل کرنے میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ کہنا بجا ہوگا کہ اب سندیلہ کی ادبی تاریخ کے حوالے سے یہ ایک مستند حوالہ ہے، جیسے دہلی اور لکھنؤ کی ادبی تاریخ کے لیے معروف تذکرے ہیں۔

☆ مبصر کا پتہ: اسسٹنٹ ایڈیٹر، پبلی کیشن ڈویژن، این سی ای آر ٹی، شری اروبندو مارگ، نئی دہلی۔ Mob: 8539054888

□□□

اردو بک ریویو میں تبصرے کے لیے
کتاب کے دو نسخے ارسال کریں۔ (ادارہ)

پروفیسر ممتاز احمد کی ادبی خدمات

مرتب: ڈاکٹر خالد سجاد

تبصرہ: ابراہیم افسر☆

پروفیسر ممتاز احمد خاں اُردو ادب میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ وہ بیک وقت استاد، شاعر، نقاد، مترجم تھے۔ موصوف دانا پور (بہار) میں 6 اپریل 1933 کو پیدا ہوئے اور زندگی کی 65 بہاریں دیکھنے کے بعد پٹنہ میں 26 جون 1998 کو پیوند خاک ہوئے۔ انہوں نے اپنی ابتدائی تعلیم مدرسہ اصلاح المسلمین پٹنہ سے حاصل کی۔ عصری تعلیم مسلم ہائی اسکول اور بہار نیشنل کالج پٹنہ میں ہوئی۔ 1954 میں پٹنہ یونیورسٹی سے انہوں نے ایم اے اوّل پوزیشن سے پاس کیا۔ 1957 میں پروفیسر کلیم الدین احمد کی زیرنگرانی ،مثنویاتِ راسخ' موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھا۔ بہار پبلک سروس کمیشن کے ذریعے موصوف نے شعبہ اُردو پٹنہ یونیورسٹی میں اپنی خدمات انجام دینا شروع کیں۔ 1970 میں پروفیسر ممتاز احمد خاں نے ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کی۔ اسی سال پروفیسر موصوف کو ریڈر اور 1981 میں صدر شعبہ اُردو بنایا گیا۔ اب تک پروفیسر ممتاز احمد کی چھے کتابیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں جن میں مثنویات راسخ، کلیم الدین احمد کی شاعری پر ایک نظر، اُردو شعرا کا تنقیدی شعور، حدیثِ سخن، مکاتیب شہباز اور کلیم الدین احمد کی انگریزی کتاب Psycho Analysis and Literacy Criticism کا اُردو ترجمہ تحلیل نفسی اور ادبی تنقید اہمیت کی حامل ہیں۔

زیرنظر کتاب 'پروفیسر ممتاز احمد کی ادبی خدمات' کو ڈاکٹر خالد سجّاد نے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصے میں 13 مضامین ،جن میں حسرتِ تعمیر: ایک مطالعہ، ایک غیر مطبوعہ قصیدہ، طلبا کو سہولتیں، اپنی تلاش میں، بچوں کے ادب میں شہباز کا حصہ، کلیم عاجز اور ان کا فن، جمیل مظہری کا تنقیدی شعور،

صفحات: 398 قیمت:-/202 اشاعت:2016
ملنے کا پتہ: بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ-800004
Mobile: 9953630788
مرتب سے رابطہ:9430940225

حسرت موہانی اور اُردو صحافت، اکبر کا اصولِ نقد، عظیم الدین احمد بہ حیثیت نظم نگار، سید سلیمان ندوی بہ حیثیت شاعر، اور تیری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو قابلِ ذکر ہیں۔ دوسرے حصے میں پروفیسر ممتاز احمد کے مقدموں اور تبصروں کو شامل کیا گیا جن میں مقدمہ: نشاطِ کرب، مقدمہ: مکاتیبِ شہباز، تبصرہ خار وخس اور تبصرہ اس حمام میں قابلِ ذکر ہیں۔ تیسرے حصے میں شعری جہتوں بالخصوص مثنویاتِ راسخ، کلیم الدین احمد کی شاعری پر ایک نظر، اُردو شعرا کا تنقیدی شعور، حدیثِ سخن اور نظم معذرت کو کتاب میں جگہ دی گئی۔

پروفیسر ممتاز احمد کی تحریروں میں کلیم الدین احمد کی تنقیدی شعور کا عکس نمایاں ہے۔ اس بات کو ڈاکٹر خالد سجاد نے اپنے پیش لفظ میں کئی مرتبہ دہرایا ہے۔ ممتاز صاحب کی پہلی کتاب 'مثنویاتِ راسخ' کو خاص پذیرائی حاصل ہوئی۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ان سے پہلے راسخ عظیم آبادی پر تحقیق برائے نام کی گئی تھی۔ ممتاز احمد کے اس کام کی تعریف کلیم الدین احمد اور قاضی عبدالودود نے بھی کی۔

مضمون 'ایک غیر مطبوعہ قصیدہ' میں جمیلہ کے ایک غیر مطبوعہ قصیدے کی دریافت پر اپنا مطمح نظر واضح کیا گیا ہے۔ انہوں نے جمیلؔہ کے بارے میں لکھا گیا کہ جمیلہ نے شاد عظیم آبادی سے اصلاح سخن لیا۔ حالاں کہ ان کے اشعار میں راضیہ، خاتون، اور جمیلہ تینوں تخلص موجود ہیں۔ ان کے بارے میں ممتاز صاحب کا یہ بھی دعوا ہے کہ جمیلہ، خان بہادر خدابخش خاں آئی سی آئی بانئ خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری کی اہلیہ تھیں۔ ان کے آٹھ دیوان اور ایک طویل مثنوی 'احسن المطالب' خدابخش لائبریری میں موجود ہیں۔ پروفیسر ممتاز احمد نے 'قصیدہ در مدح اہلیہ خان بہادر' کو اسی لائبریری سے دریافت کیا۔

پروفیسر ممتاز احمد نے اپنے استاد اور مشہور نقاد پروفیسر کلیم الدین احمد کی خودنوشت 'اپنی تلاش میں' کا مختصر تنقیدی جائزہ قلم بند کیا۔ انہوں نے مضمون کی ابتدا میں اُردو خودنوشت کے اصول و نظریات پر گفتگو کی۔ اس کے بعد مغربی ادب میں خودنوشت کے تعلق سے اہم نظریات کو قارئین کے سامنے رکھا۔ کلیم الدین احمد کی یہ خودنوشت سوانح عمری جنوری 1975 میں منظرِ عام پر آئی تھی۔ اس

خودنوشت کے ابتدائی صفحات میں کلیم الدین احمد نے Andrew Marvell اور John Clare کے اقوال درج کیے ہیں۔

پروفیسر ممتاز احمد کا مضمون 'بچوں کے ادب میں شہباز کا حصہ' اہمیت کا حامل ہے۔ انہوں نے عبدالغفور شہباز کے 'رباعیاتِ شہباز' (اشاعت 1891، کلکتہ) اور 'خیالاتِ شہباز' (اشاعت 1916، نظامی پریس بدایوں) اور 'تفریح القلوب' میں مذہب، فطرت، تعلیم، تمدن اور اخلاقی قدروں پر مشتمل رباعیات کو موضوعِ بحث بنایا ہے۔ ممتاز صاحب کے مطابق ان کی رباعیوں میں بچوں کے لیے خصوصیت کے ساتھ دماغی ورزش ہے، دلچسپی بھی اور اسی کے ساتھ ساتھ اخلاقی سبق بھی اور شہباز کی قادر الکلامی بھی۔ شہباز کی ایک رباعی ملاحظہ کیجیے جس میں ہر انسان سے کام کو اپنے مقررہ وقت پر کرنے کی تلقین ونصیحت کی گئی ہے:

کہتے ہو کہ کر لیں گے ہم اس کام کو کل
ایسا نہ ہو کل بھی ہاتھ سے جائے نکل
جس کل سے بنے آج ہی فرصت کر لو
کل چاہے چلے یا نہ چلے کام کی کل

پروفیسر ممتاز احمد نے مضمون 'اکبر کا اصولِ نقد: ان کے اشعار کی روشنی میں' اکبر الہ آبادی کے سخن، تخلیقی عمل، موضوعِ غزل، شاعری کا مقصد اور مختلف جہتوں کے متعلق اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ مصنف نے اکبر کے کلام کو قارئین کے سامنے پیش کیا جس میں شعری نقد واصول پنہاں ہیں۔ اس موقع پر اکبر الہ آبادی کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

معنی کو چھوڑ کر جو ہو نازک بیانیاں
وہ شعر کیا ہے، رنگ ہے لفظوں کے خون کا

....

یہ بڑا عیب مجھ میں ہے اکبر
دل میں جو آئے کہہ گزرتا ہوں

'مقدمہ: نشاطِ کرب' میں پروفیسر ممتاز احمد نے اسلم آزاد کے شعری کمالات وتخیلِ پرواز پر بحث کی ہے۔

پروفیسر ممتاز احمد کے شعری مجموعے حدیثِ سخن پر پروفیسر کلیم الدین احمد نے اپنے پیش لفظ میں لکھا کہ نئی شاعری، ترقی پسند شاعری کی طرح ایک فلسفہ بھی ہے اور شاعری بھی، فلسفہ مانگے کا ہے۔

ڈاکٹر خالد سجاد نے اپنی محنت شاقہ سے پروفیسر ممتاز احمد کے ادبی کارناموں کو یکجا کر کتابی قالب میں پیش کیا۔ انہوں نے ہر مضمون کے آخر میں تاریخِ اشاعت کا اہتمام کیا۔ موصوف تعمیری ادب کے ایک فعال رکن ہیں۔ اس موقع پر یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ پروفیسر ممتاز احمد کی نثر بہت ہی شگفتہ وسلیس ہے اور ان کے اشعار لوگوں کے قلوب پر اپنا اثر چھوڑتے ہیں۔ ممتاز صاحب نے اپنی سادہ بیانی سے وہ بات کہہ دی جس کے لیے شعرا پیچیدہ بیانی و بیجا تراکیب کا استعمال کرتے ہیں۔ آخر میں ممتاز صاحب کی طویل نظم 'حدیثِ سخن' سے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

میں نہ شاعر نہ فلسفی نہ امیر
میں نہ صوفی نہ مولوی نہ فقیر
میں نہ اہلِ نظر نہ اہلِ دماغ
میں نہ آندھی نہ آندھیوں میں چراغ
ختم کر اپنی داستاں ممتاز
خامہ کہتا ہے الاماں ممتاز

☆ مبصر کا پتہ: وارڈ نمبر 1، مہپا چوراہا، نگر پنچایت سوال خاص، ضلع میرٹھ — 250501 (یوپی) موبائل 9897012528

□□□

اسیم کاویانی کی مرتبہ دو دستاویزی کتب
شمس کنول کے مشہور زمانہ جریدے 'گگن' کے
بائیس برس کے پرچوں کا انتخاب
انتخاب گگن
(مع 'افق تا افق' علی گڑھ)
مجلد دو جلدوں میں، قیمت: -/2000 روپے (سِٹ)
ہندستانی مسلمان
'گگن' میگزین کے 'ہندستانی مسلمان نمبر' کی تشکیل جدید
سائز: 20x30/8، صفحات: 408، قیمت: -/800
رابطہ: اردو بک ریویو، دریا گنج، نئی دہلی۔
Mobile: 9953630788

شاعری میں شہر جونپور

مؤلف: محمد عرفان جونپوری

تبصرہ: سہیل انجم☆

محمد عرفان جونپوری کا نام میں بہت پہلے سے سنتا اور پڑھتا رہا ہوں۔ لیکن ان سے میری پہلی ملاقات 2023 میں مجلہ ادب سلسلہ کے ایک ادبی پروگرام میں الہ آباد میں ہوئی جس کا اہتمام مجلے کے مدیر سلیم انصاری نے کیا تھا۔ اس وقت ان سے کافی دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ گفتگو کا محور شہر جونپور تھا۔ میں جونپور کی علمی و تاریخی حیثیت سے کسی حد تک واقف ہوں اور خواہش ہے کہ کبھی شیراز ہند کی زیارت نصیب ہو۔ تادم تحریر اس کی زیارت تو نصیب نہیں ہوئی لیکن ایک عاشقِ شیرازِ ہند یعنی محمد عرفان جونپوری سے ملاقات ہو گئی اور میں اسے خواب میں شیراز ہند کی زیارت کے مساوی سمجھتا ہوں۔ یوں تو ہر شخص کو اپنے وطن سے پیار ہوتا ہے اور اپنی جنم بھومی سے محبت ہوتی ہے۔ لیکن اپنی جنم بھومی سے موصوف جتنی شدت سے محبت کرتے ہیں اس کی مثال کم ہی ملے گی۔ اس کے ثبوت میں بس یہ دو باتیں کافی ہیں۔ ایک تو ان کی جانب سے جونپور کے حوالے سے کتابوں کا ذخیرہ اکٹھا کرنا اور دوسرے جونپور کے علمی، تہذیبی و ثقافتی تنوع سے اہل علم کو واقف کرانا یعنی خود جونپور پر کتابیں تصنیف کرنا۔ زیر تبصرہ کتاب بھی اسی کی شہادت دیتی ہے۔ اس کے علاوہ حفیظ جونپوری ارباب ادب کی نظر میں، جونپور کے چند شعرا، فکر وشعور، کائنات ضیاء قادری، ضیائے غزل، ضیائے غزل ہندی، تذکرہ علمائے جونپور، کتابیات جونپور اور تذکرہ مشاہیر جونپور اس پر مستزاد ہیں۔ ان کے بارے میں مشہور ہے کہ جونپور یا اہل جونپور کے سلسلے میں کہیں بھی کوئی کتاب شائع ہو تو یہ اسے حاصل کر کے ہی دَم لیتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسے موضوعات سامنے

صفحات: 215 قیمت: -/275 اشاعت: 2025
ناشر: عزیزیہ لائبریری، میرمست، جونپور-222001 (یوپی)
Mobile: 9889124056

لاتے ہیں جو شہر جونپور سے وابستہ ہوں۔ اب یہی دیکھیے کہ انہوں نے اردو کی شعری کائنات میں سے جونپور سے متعلق موتی برآمد کر لیے اور انہیں ایک لڑی میں پرو کر اہل علم کے سامنے پیش کر دیا۔

متعدد شعرا نے جونپور پر نظمیں کہی ہیں۔ اس کے فضائل و مناقب بیان کیے ہیں۔ نظموں کے علاوہ لوگوں نے قطعات بھی لکھے ہیں۔ لیکن یہ ذخیرہ ادھر ادھر بکھرا ہوا تھا۔ ضرورت تھی کہ ان کو یکجا کیا جائے اور کتابی شکل میں شائع کیا جائے۔ بھلا یہ کام محمد عرفان جونپوری نہیں کرتے تو کون کرتا۔ حالانکہ اسی جونپور میں اہل علم کی کمی نہیں ہے۔ دہلی میں بھی جونپور کے سپوت موجود ہیں جنہوں نے علمی دنیا میں اپنی ایک شناخت قائم کر رکھی ہے۔ لیکن یہ کام موصوف کے حصے میں آیا۔ وہ لکھتے ہیں:

''سرمایہ سامنے تھا۔ مزید سرمایے کی دستیابی کے لیے بھی تلاش وجستجو کو تیز کر دیا۔ بزرگوں کی مطبوعہ، غیر مطبوعہ اور دیگر یادگاروں میں ان مخفی خزانوں کو تلاش کرنے میں جی جان سے لگ گیا۔ اسی سلسلے میں مہدوی فرقے کے ترجمان مہر ولایت میں بھی چند نظمیں مل گئیں۔ اس کے لیے کیسے کیسے اور کتنے ہفت خواں طے کرنے پڑے یہ ایک الگ ہی داستان ہے جس کی تفصیل سے فائدہ نہیں اور سنے گا بھی کون۔ میرے لیے مقام مسرت ہے کہ میری گزارش پر موجودہ دور کے شعرائے کرام نے بھی لبیک کہا اور اپنی گراں قدر تخلیقات سے اس مجموعے کے حسن میں چار چاند لگایا۔ میں نے اپنے ان کرم فرما شعرا کے کلام کے ساتھ ان کا ایک مختصر تعارف بھی پیش کر دیا ہے جو مفید بھی ہوگا اور شاید دلچسپی سے خالی بھی نہیں ہوگا''۔

محمد عرفان جونپوری نے کتاب میں ایک وقیع مقدمہ بھی لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ہندوستان میں اسلام کی آمد کے بعد سے ہی جونپور آہستہ آہستہ تہذیب وتمدن کا گہوارہ بننا شروع ہو گیا تھا۔ لیکن جب فیروز شاہ تغلق (1388-1309) نے باضابطہ جونپور کی بنیاد رکھی تب سے ہی جونپور سیاسی وجغرافیائی اعتبار سے اہم ہونا شروع ہو گیا تھا۔ گو کہ فیروز شاہ تغلق سے قبل جونپور سلطنت کا بانی سلطان الشرق ہی تھا۔ اس سلسلے میں انہوں نے میاں محمد سعید کی کتاب 'تذکرہ مشاہیر شیراز ہند جونپور' سے

حوالہ دیا ہے۔ مقدمہ میں جونپور کی تاریخ پر گہری نظر ڈالی گئی ہے اور تاریخی کتابوں کے حوالے سے مزین کیا گیا ہے۔ جونپور کی تاریخی عمارتوں کے بارے میں لکھتے ہیں کہ جونپور میں تاریخی عمارتوں کا جال پھیلا ہوا ہے جن کا جلال و جمال آج بھی ماضی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔جس سے اس کے بنوانے والوں کی قوت ایمانی کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ یہ عمارتیں زیادہ تر جونپوری فن تعمیر سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان میں ہندومسلم مشترکہ تہذیب کا امتزاج بھی ملتا ہے۔ انہوں نے مضمون کے آخری حصے میں تاریخی عمارتوں کے نام بھی گنائے ہیں۔

اس کا تقدمہ (مقدمہ) حکیم وسیم اعظمی نے لکھا ہے۔ وہ محمد عرفان جونپوری کے بارے میں لکھتے ہیں:

''جونپور کے حوالے سے ان کی زنبیل میں بہت سی بیش قدر اشیا ہیں جو جونپور کی توقیت وتفہیم میں رہنما خطوط کی حیثیت رکھتی ہیں۔ حدتو یہ کہ وہ غالب اورفن صحافت میں بھی جونپورزاویہ نکال لیتے ہیں کہ یہ ان کے مزاج کا حصہ ہے۔... عرفان جونپوری کا زیرنظر مسودہ'شاعری میں شہر جونپور' بھی'فنافی الجونفور' کا ایک استعارہ ہے۔ اس میں جونپور کے حوالہ سے شعرا کے کلام شامل کیے گئے ہیں۔بعض کلام تو قدیم مصادر میں ملتے ہیں اور بہت کچھ مؤلف نے فرمائش، تقاضے اور مطالبے سے کہلوائے ہیں جوفارسی اوراردو میں ہیں۔''

حقانی القاسمی نے بھی اس کتاب کے حوالے سے جونپور کے بارے میں شاعری پر گہری نظر ڈالی ہے اور ولی دکنی سے لے کرعہد حاضر کے شعرا کے کلام میں جونپور کے تذکرے پر تفصیلی مضمون تحریر کیا ہے۔ ان کے مطابق محمد عرفان جونپوری کا یہ کام اس روایت کی ترتیبی توسیع اور تسلسل ہے جس کے تحت مرزا اسد اللہ خاں غالب نے اسطوری شہر بنارس پر'چراغ دیر' کے عنوان سے مثنوی لکھی اور حرمت الاکرام نے 'کلکتہ ایک رباب' جیسی مسدس میں طویل نظم تحریر کی۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے شاعروں نے مختلف شہروں کی صورت گری کی ہے۔ مجھے امید ہے کہ اس کتاب سے ایک نئی راہ روشن ہوگی۔

نظموں کا آغاز محمد صادق کی فارسی نظم 'صبح صادق' سے ہوتا ہے۔ نظم کے نیچے نوٹ کے مطابق یہ قلمی نسخہ برٹش میوزیم لندن میں موجود ہے اور یہ نظم مشہور مؤرخ میاں محمد سعید (پاکستان) کی کتاب 'تذکرہ مشائخ شیراز ہند جونپور' میں شامل ہے۔ اس کے بعد جن شعرا کی نظمیں شامل ہیں ان میں ڈاکٹر احمد علی برقی اعظمی، آسی غازی پوری، غبار جونپوری، صفی لکھنوی، حفیظ جونپوری، دماغ جونپوری، وامق جونپوری، رہبر جونپوری، طفیل انصاری، انیس منیری، عبرت مچھلی شہری، اشتیاق احمد ضیا جونپوری، احمد نثار جونپوری، ڈاکٹر اختر سعید مسیحا جونپوری، (مولانا) عبد الوحید قاسمی، احمد حفیظ جونپوری، خلیل ابن اثر جونپوری، اسلم مچھلی شہری وغیرہ 35 شعرا کی نظمیں ہیں۔ جبکہ 15 شعرا کے قطعات اور 9 شعرا کے متفرق اشعار ہیں۔ شاعری کے اس ذخیرے میں جونپور کو شاندار خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ شہر کی عمارتوں اور دیگر چیزوں پر منظوم کلام لکھا گیا ہے۔

اس مجموعے کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بظاہر یہ کام آسان لگتا ہے لیکن آسان ہے نہیں۔ یہ کام صبر آزما بھی ہے۔ محمد عرفان جونپوری کے لیے اس علمی کام کو کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں رہا ہوگا۔ حالانکہ انہوں نے صرف مہدوی فرقے کے ترجمان کی حصولیابی کے سلسلے میں لکھا ہے کہ اس کے لیے کیسے اور کتنے ہفت خواں طے کرنے پڑے یہ الگ داستان ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ پورا کام ہفت خواں طے کرنے ہی کے زمرے میں آئے گا۔ ان کے اس کام کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ یہ کتاب جونپور شناسی میں ایک اہم اضافہ ثابت ہوگی۔ توقع ہے کہ اہل علم کی جانب سے اس گراں قدر کاوش کی خاطرخواہ پذیرائی ہوگی۔

☆ مبصر سے رابطہ: اوکھلا، نئی دہلی۔ Mob: 9818195929

□□□

تذکرہ شعرائے بریلی
(1749 تا 1949)
مصنف: ڈاکٹر سیّد لطیف حسین ادیب
صفحات: 608 قیمت: -/700
رابطہ: اردو بک ریویو، دریا گنج، نئی دہلی
Mobile: 9953630788

تفہیم و تعبیر

(ادبی، تحقیقی و تنقیدی مضامین)

مصنفہ: ڈاکٹر ثمر جہاں (موبائل:9213100527)

تبصرہ: ایم نصر اللہ نصر☆

مضامین نگاری کوئی سہل مشغلہ نہیں اور وہ بھی تحقیقی اور تنقیدی مضامین نویسی مگر کیا کیا جائے جہان ادب میں جو نو وارد ان قدم رکھتے ہیں وہ بہت جلد خود کو اس مشغلے کے ماہر فنکار تصور کرنے لگتے ہیں۔ جیسے ہی کچھ بھی لکھا اس کی تشہیر کے ساماں کی بازیافت میں لگ جاتے ہیں۔ انہیں دراصل ذرا ٹھہرنا چاہیے۔ ایک نظر اور ڈالنی چاہیے۔

میں یہ باتیں مصنفہ موصوف کے تعلق سے نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ عام روِش کی بات کر رہا ہوں۔ ڈاکٹر ثمر جہاں نے اس کا خیال رکھا ہے۔ ان کے مضامین میں عجلت پسندی کے سامان نہیں۔ پہلے مضامین کو لکھا ہے، پھر پرکھا ہے تب جا کر کتاب کے حوالے کیا ہے۔ اس کتاب میں ان کے 22 مضامین شامل ہیں جو لائقِ مطالعہ ہی نہیں قابل داد و تحسین ہیں۔ ان کی اس کتاب میں شخصی مضامین کے علاوہ اہم کتابوں پر تجزیے بھی شامل ہیں۔ ہر مضمون میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ اسے مضامین کے اجزائے ترکیبی کے دائرے میں لکھا جائے تاکہ مضمون کے تسلسل اور تعبیر و تفہیم میں سہولت پیدا ہو۔ ڈاکٹر ثمر جہاں نے لکھا ہے کہ 'تفہیم و تعبیر' ان کی پہلی کتاب ہے جو زیادہ تر سمیناروں میں پڑھنے کے لیے لکھے گئے مضامین ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ ادب کی صحت مند تعمیری و مثبت قدروں کی حامی ہیں۔ لکھنے پڑھنے کا شوق بچپن سے ہے۔ ادبی دنیا میں ان کی پہچان 2014 میں ہوئی جب ان کا پہلا مضمون ماہنامہ 'آجکل' میں شائع ہوا۔ بعد ازاں

صفحات: 170 قیمت: -/250 اشاعت: 2025
ISBN 978-93-6691-309-4
ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، A-170 گراؤنڈ فلور-3، سوریہ اپارٹمنٹ، دلشاد کالونی، دہلی-110095

اردو کے ادبی رسائل میں شائع ہونے لگے۔ سمیناروں میں پذیرائی بھی ہونے لگی۔ کچھ مضامین کے اقتباسات ملاحظہ فرمائیں:

''سب سے پہلے ڈپٹی نذیر احمد نے اصلاح کی کامیاب سعی کی اور یہ محسوس کیا کہ جب تک مستورات کے دلوں میں علم کی شمع روشن نہ کی جائے گی تب تک ان کی ذہنی بیداری ممکن نہیں۔''

''بیسویں صدی کے اوائل میں خواتین کے ذہنی شعور میں بیداری کی لہر پیدا کرنے کے لیے متعدد نسائی رسائل منظر عام پر آئے جن میں بالخصوص تہذیب نسواں، لاہور (1898 مدیر ممتاز علی) خاتون' علی گڑھ، (1904، مدیر شیخ محمد عبداللہ اور 'عصمت' دہلی 1908، از راشد الخیری) کے نام قابل ذکر ہیں۔

''ترقی پسند افسانہ نگاروں کے کارواں میں خواجہ احمد عباس (1914 تا 1987) کا نام خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ 73 برس کی زندگی میں ان کی تخلیقات کا دائرۂ فکر صرف فکشن تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ وہ بیک وقت ہفت روزہ اخبار 'بلٹز' کے بے باک کالم نگار اور فلموں کے ہدایت کار بھی رہے۔''

''خواجہ احمد عباس کے افسانوں میں ہمیں وطن پرست انسانیت کی ڈور تھامے ہوئے کردار ملتے ہیں وہ چاہے کسان ہو یا مزدور۔ کلرک ہو یا افسر، ٹیچر ہو یا ڈاکٹر، انجینئر ہو یا اداکار، صحافی ہو یا کامریڈ۔ یہ تمام کردار آزاد ہندوستان کے دوران رونما ہونے والے واقعات میں کہیں دکھی اور غمزدہ ہیں تو کہیں نئے ہندوستان کے آئین میں مساوات اور ہم آہنگی کے آرزو مند، غرض ان کی تخلیقات میں ہمیں ہندوستانی عوام کی گوناگوں تصویریں نظر آتی ہیں۔''

مذکورہ اقتباسات سے انکشاف ہوتا ہے کہ ڈاکٹر ثمر جہاں نے اردو ادب کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ اس کے رموز کو سمجھا ہے، اس کی باریکیوں پر ان کی نظر ہے۔ وہ فکشن نگاری کے تقاضے سے واقف ہیں۔ موصوفہ نے اس مضمون میں خواجہ احمد عباس کی افسانہ نگاری کا اجمالی جائزہ لیتے ہوئے بتایا ہے کہ خواجہ احمد عباس نے اپنے افسانوں میں ہندوستان کے انگنت مسائل کو زیر بحث لایا ہے اور قاری کے ذہن کو بیدار کیا ہے۔ غربت، رشوت خوری، بے روزگاری، بھوک اور افلاس کو اپنا موضوع بنایا ہے۔

کرشن چندر کے افسانوں میں رومان اور حقیقت کے رنگوں

کی آمیزش کو عکس ریز کیا ہے۔ انہوں نے بتایا ہے کہ فطری طور پر کرشن چندر جمال پرست تھے، کشمیر کی حسین وادیوں میں شعور کی منزلیں طے کیے تھے۔ وہ اکثر کائناتی حسن کو گلبرگہ کی بالکونی سے تو کبھی گرجن کی برفیلی چوٹیوں سے سرسبز و شاداب مناظر کو دیکھا کرتے تھے جہاں شفق کی سرخی، پہاڑی جھرنے، قوس و قزح، کہکشاں زدہ افلاک، چنار کے درخت، زعفران کے کھیت، چاندنی راتیں اور حسین نسوانی خدوخال کی روحانی کشش کو محسوس کرتے۔ انہوں نے اردو افسانے کو نیا اسلوب عطا کیا۔

یہ اقتباس بھی راقمہ کی تفہیم و تعبیر کی منزلت کو اجاگر کرتا ہے۔ ان کے اندر پوشیدہ ادبی شعور کی رو کو طشت از بام کرتا ہے۔ ان کے علمی اور ادبی ذوق سے قاری آشنا ہوتا ہے۔ زیر مطالعہ کتاب میں 14 ادبی و تنقیدی اور 8 تحقیقی مضامین شامل ہیں۔ ادبی اور تحقیقی اعتبار سے سارے مضامین لائق ستائش ہیں لیکن تنقیدی اعتبار سے تشفی بخش نہیں ہیں۔ کسی بھی مضمون میں تنقید کے تعلق سے کھل کر بحث موجود نہیں۔ تقریظ کی حدیں پار تو کی گئی ہیں مگر تنقید سے دامن بچایا گیا ہے۔ اگر کتاب میں تنقیدی مضامین ہیں تو ہر مضمون میں دو چار جملے ایسے ہونے چاہئے جس سے ظاہر ہو کہ خامہ بگوش نے اس طرف بھی جھانکنے کی کوشش کی ہے جدھر دریچے پر گہرے رنگ کے پردے ٹانک دیئے گئے تھے۔ یا خود اپنے ذہن کی وہ کھڑکی کھولنے کی جسارت نہیں کی ہے جہاں سے سچائی عکس ریز ہوتی ہے۔

چند مزید تقاضوں کے باوجود ڈاکٹر ثمر جہاں نے اس کتاب کی تصنیف میں کافی محنت کی ہے اور ذہنی کاوش کا مظاہرہ کیا ہے۔ ایک ایک مضمون کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ ڈھیر ساری معلومات کو اس کتاب میں اکٹھا کر دیا گیا ہے۔ اس لیے قارئین کو اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہئے اور ان کی پذیرائی بھی کرنی چاہئے۔ اس اہم کام کے لیے موصوفہ کو بہت بہت مبارکباد۔

☆ مبصر کا پتہ: شالیمار اپارٹمنٹ، 3/A ستین بوس روڈ، بلاک C، بکولتا، ہاوڑہ-711109 (مغربی بنگال) موبائل:9339976034

□□□

ماہنامہ بندگی ربّ

مدیر: محمد رشاد رفعت

تبصرہ: محمد عارف اقبال

سالِ رواں (2026) میں ماہنامہ 'بندگی ربّ' کا اجرا اس لحاظ سے خوش آئند ہے کہ عام مذہبی اور دینی رسائل سے الگ اس میں عصر حاضر کے موضوعات پر فکر انگیز مضامین شامل ہیں۔ اس رسالے کا نام 'بندگی ربّ' بھی موجودہ 'مذہبی ماحول' میں ایک مخصوص اشارہ محسوس ہوتا ہے۔ اس کے مدیر محمد رشاد رفعت کے والد ڈاکٹر محمد رفعت (مرحوم) آئی آئی ٹی کانپور کے ڈاکٹریٹ تھے۔ وہ اپنی حیات تک جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی کے شعبہ انجینئرنگ میں اپلائڈ فزکس کے پروفیسر رہے— ڈاکٹر محمد رفعت جماعت اسلامی ہند کے ترجمان ماہنامہ 'زندگی نو' کے ایک عرصہ تک مدیر بھی رہے۔

اس رسالہ کی مجلس ادارت میں عبدالملک داؤدی، ڈاکٹر محمد اکرم السلام اور انوارالحق بیگ کے نام شامل ہیں۔ اس کے مضمون نگاروں میں ایک اہم نام مولوی محمد یٰسین پٹیل فلاحی کا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یٰسین پٹیل صاحب کے گراں قدر مشورے سے اس رسالہ کو سینچنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یٰسین پٹیل صاحب اگرچہ جذباتی لیکن ایک مخلص اور غور و فکر کے حامل انسان ہیں۔ دینی، تحریکی اور تنظیمی امور سے متعلق کم سے کم چالیس برسوں کا تجربہ رکھتے ہیں۔

اس رسالہ کے مدیر محمد رشاد رفعت اور ان کی ٹیم مبارکباد کے مستحق ہیں کہ 'قحط الرجال' میں انہوں نے دعوتِ حق کی ایک ایسی راہ منتخب کی ہے جو آمائشوں سے پُر اور خاردار ہے۔ 'بندگی ربّ' کا اعلامیہ تقاضا کرتا ہے کہ علمی تیاری میں پوری ٹیم ایکسی لنس (Excellence) کے مرتبہ پر فائز ہو۔ اس بات کا

جلد 1، شمارہ 4، اپریل 2026، صفحات 64،
قیمت: سالانہ -/350 روپے
پتہ: D-195، سکنڈ فلور، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر،
نئی دہلی-110025 واٹس ایپ:8750488985

ادراک ضروری ہے کہ اسلام مذہب نہیں بلکہ اللہ رب العالمین کا 'دین' (Way of Life) ہے۔ اِنّ الدین عنداللہ الاسلام کا فریضہ اُس وقت ادا ہوسکتا ہے کہ جب ہماری تحریروں میں خالصتاً تحقیقی رنگ غالب ہو اور تقویٰ کی روِش پر ہم قائم رہیں۔ حقیقی اسلام جو محجوب ہوتا جا رہا ہے ان حجابات سے اگر ہم چھٹکارا حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے تو 'دین اللہ' نکھر کر سامنے آسکتا ہے۔ لیکن اس کے نتیجے میں نام نہاد مذہبی حلقے کی مخالفت بھی سدِّ راہ بن سکتی ہے۔ دور جدید میں مخلص افراد کی طرف سے ہر ماہ کسی دینی رسالے کی اشاعت محض چند صفحات سیاہ کرنا نہیں بلکہ علمی وصحت مند فکری رجحان کو اجاگر کرنا ہے۔ ماہنامہ 'بندگی ربّ' کے لیے یہ تعارفی وتمہیدی کلمات اس لیے تحریر کیے گئے ہیں کہ دیگر 'مذہبی رسائل' کے علی الرغم اس میں امید ورجائیت کے پہلو نظر آتے ہیں۔

اس رسالہ کے اب تک چار شمارے منظر عام پر آچکے ہیں۔ میرے پیش نظر اس وقت شمارہ اپریل ہے۔ جنوری تا مارچ 2026 کے شمارے بھی خاکسار کے مطالعے میں رہے ہیں۔ زیر نظر شمارے کا اداریہ 'لڑادے ممولے کو شہباز سے' خوب سے خوب تر ہے۔ ایران بہ مقابلہ امریکہ واسرائیل جنگ کا تجزیاتی مطالعہ قابل توجہ ہے۔ البتہ اداریہ میں ایک جگہ 'اسلامی شیعی انقلاب' لکھا گیا ہے حالانکہ 'اسلامی انقلاب' لکھنا ہی حقیقت سے قریب تر ہے۔ 'سلسلہ انذار وتبشیر' کے عنوان سے حضرت نوح (علیہ السلام) کے قرآنی احوال پر مشتمل مضمون مولوی محمد یٰسین پٹیل فلاحی کے قلم سے ہے۔ اس شمارے میں مضمون کی تیسری قسط ہے جو ہنوز جاری ہے۔ یہ مضمون اس لحاظ سے بے حد اہم ہے کہ اس میں حضرت نوح (علیہ السلام) کا قرآنی مطالعہ عصر حاضر کے تناظر میں کیا گیا ہے۔

'دوکشتیوں کا مسافر' مضمون میں بلال شوکت آزاد نے سورۃ الکافرون کا مطالعہ بڑے دلنشیں انداز میں کیا ہے۔ موجودہ دور میں مداہنت (Compromise) کی جتنی صورتیں نظر آتی ہیں اور جنہیں قابل قبول ہونے کی سند بھی دی جا رہی ہے، مضمون نگار نے بڑے مدلل انداز سے ان صورتوں کی بیخ کنی ہے۔ سورۃ الکافرون کا یہ فکر انگیز مطالعہ مدلل اور سائنٹفک ہے۔ اس مضمون میں بتایا گیا ہے کہ کوئی بھی انسان بیک وقت دوکشتیوں پر سوار نہیں ہوسکتا ہے۔

رسالہ کے مدیر محمد رشاد رفعت کے مضمون 'نصب العین ایک امانت' میں اسلامی جماعتوں اور اسلامی تحریکات کے موجودہ قائدین وکارکنان کی توجہ مبذول کرائی گئی ہے۔ مضمون نگار ایک جگہ لکھتے ہیں ''ایک طرف تو اسی نصب العین کو ماننے کا دعویٰ کرتے ہیں جس کے لیے اسلافِ تحریک نے قربانیاں دیں اور دوسری طرف تمام ایسی کوششیں کرتے ہیں کہ لوگوں کی رائے اس نصب العین کے خلاف ہموار ہوجائے اور وہ نصب العین اس تحریک کے لیے باقی ہی نہ رہے۔'' (صفحہ 28)

یہ مضمون ان کے لیے چشم کشا ہے جو بحیثیت مومن خود کو اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کے احکام کے حوالے کردے لیکن چھوٹے بڑے مفاد اور ذرا سی آزمائش کو دیکھ کر بعض اوقات اکثر افراد تمام اصولوں اور اخلاقی اوصاف سے دستبردار ہونے کو تیار ہوجاتے ہیں۔

انوار الحق بیگ کا مضمون 'القدس کی فضیلتیں وبشارتیں: چند عصری دانشوروں کا رویہ' دو قسطوں میں شائع کیا گیا ہے۔ دونوں قسطیں بالترتیب مارچ اور اپریل کے شمارے میں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔ اپنے مضمون میں انوار الحق بیگ نے وحید الدین خاں صاحب اور غامدی صاحب کے خیالات کا تعاقب کرتے ہوئے ان کے گمراہ کن خیالات کو مدلل انداز سے اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ مضمون نگار نے ناجائز ریاست اسرائیل کے پہلے وزیر اعظم ڈیوڈ بن گوریان کے ایک خط (1956) کے حوالے سے لکھا ہے کہ اسرائیل کا وجود کھلے ظلم، غاصبانہ قبضے اور مجرمانہ سازشوں پر مبنی ہے، یہ حقیقت خود اس کے بانیوں نے تسلیم کی ہے۔ تاہم دوسری طرف ہمارے چند مسلم دانشوران اسرائیل کی حمایت میں تاریخی حقائق کی نفی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ 2021 کی ایک ویڈیو میں غامدی صاحب سے ایک سوال کیا گیا کہ ''کیا اسرائیل کو تسلیم کرلینا چاہیے؟'' تو انہوں نے جواب دیا:

''میرا ذاتی خیال ہے کہ جب 1948 میں اسرائیل معرض وجود میں آیا تھا، اس وقت ہی تمام مسلمان ممالک کو اسے تسلیم

کرلینا چاہیے تھا۔ جب دنیا میں اس طرح کی حقیقتیں وجود میں آتی ہیں تو ان کے خلاف سر مارنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا...''

انوارالحق بیگ نے اپنے مضمون کی دوسری و آخری قسط (اپریل 2026) میں علامہ سیّد ابوالاعلیٰ مودودی کے موقف کے حوالے سے لکھا ہے کہ ''انہوں نے صہیونی منصوبے کی اصل کو کھول کر رکھ دیا ہے۔ مسجد اقصیٰ کو ڈھانا اور نیل سے فرات تک کا 'عظیم تر اسرائیل' قائم کرنا، آج خود نتین یاہو اسی وژن کا کھلے عام اعلان کر رہا ہے۔''

کسی بھی رسالہ میں چند مضامین بعض اوقات بھرتی کے طور پر بھی شامل کر دیے جاتے ہیں۔ انہی میں ایک مضمون ابودردا معوذ (بھیونڈی) کا ہے۔ کاش یہ مضمون اس میں شامل نہ ہوتا۔ مجموعی طور پر یہ رسالہ علم و افکار کی دنیا میں قلب و ذہن کی تطہیر کے لیے بہتر ثابت ہوسکتا ہے۔ اس میں قارئین کا ایک گوشہ بھی ہونا چاہیے تاکہ قارئین کی آرا سے کسی بھی موضوع پر بحث کا دروازہ کھلا رہے تاکہ افہام و تفہیم میں آسانی پیدا ہو۔

□□□

معیار و میزان

رشید حسن خاں کی کتابوں پر تبصرے اور تجزیے

مرتب: ڈاکٹر ابراہیم افسر

تبصرہ: ریاض احمد قادری☆

ڈاکٹر ابراہیم افسر میرٹھی ایک پختہ کار مصنف، جواں عزم مبصر اور بالغ نظر نقاد ہیں۔ وہ اپنی بیش قیمت ادبی خدمات کی بنا پر اب ممتاز محققین میں شمار کیے جاتے ہیں۔ موصوف ہندوستان کے مایۂ ناز محقق و تدوین کار، وحید عصر جناب رشید حسن خاں (شاہجہاں پوری) کے شیدائی اور محقق ہیں۔

صفحات: 496 قیمت:-/650 اشاعت:2024
ISBN 978-81-964054-3-4
ناشر: مصنف، وارڈ نمبر 1، مہپا چوراہا، پنچایت سِوال خاص، ضلع میرٹھ-205051 (یوپی) موبائل:9897012528

تقریباً 35 کتابوں کے مصنف و مدوّن رشید حسن خاں نے تنقید و تحقیق کی کارجوئی سے اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا، پھر اس سے آگے بڑھ کر اردو متون کی تدوین پر خصوصی توجہ مبذول کی۔ موصوف نے اپنی لگن، محنت، جستجو، وسعتِ مطالعہ اور اپنی ژرف نگاہی سے تحقیق و تدوین کے میدان میں اس درجہ درک حاصل کرلیا کہ وہ برجِ تحقیق و تدوین کے ایک اہم ستون بن گئے۔ موصوف بلند پایہ متنی نقاد تھے۔ کلاسیکی اردو ادب کے متعدد شہکاروں کے متون پر محنت شاقہ کے بعد ان کے تحقیقی و تنقیدی ایڈیشن شائع کیے۔ اس سلسلہ میں رشید حسن خاں کو کبھی ایک ہی کتاب (فسانۂ عجائب) کی ترتیب و تدوین میں آٹھ سال کا عرصہ بھی صرف کرنا پڑا۔ وہ زبان کی نوک پلک سے اچھی طرح واقف تھے، اور اس کی باریکیوں کا پاس و لحاظ رکھنے والے ادیب تھے۔ انہیں اپنی تحقیقات کو استدلالی اعتبار سے مستحکم اور علمی انداز میں پیش کرنے میں مہارت حاصل تھی۔ ان کی باتیں صاف اور دوٹوک، ان کا اسلوب فصیح، اور طریق استدلال واضح اور مبرہن ہوتا تھا۔ ان ہی اوصاف کی بنا پر ان کی تحریریں آنے والی نسلوں کے لیے یقیناً ایک مستند دستاویز اور معتبر حوالے میں شمار ہوں گی۔

ڈاکٹر ابراہیم افسر کی زیر تبصرہ کتاب 'معیار و میزان' ان گراں مایہ تجزیاتی تحریروں کا مجموعہ ہے جنہیں اردو زبان کے بالغ نظر ادیبوں اور اہل شعور نقادوں نے رشید حسن خاں کی مختلف تصانیف اور تدوین شدہ کتابوں کے بارے میں وقتاً فوقتاً تحریر کیا تھا، اور ان کی علمی و ادبی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا تھا۔ اس کتاب کے فاضل مرتب نے مختلف جرائد و رسائل میں منتشر ان اہم تبصروں کو بڑی محنت و کاوش کے بعد یکجا کیا، پھر انہیں سلیقے سے ترتیب دے کر قارئین کے مطالعہ کے لیے پیش کیا ہے۔

کتاب کا آغاز (مولانا) الطاف حسین حالی کی 'حیات سعدی' کے ایڈیشن مطبوعہ 1970 پر عبداللطیف اعظمی کے مختصر تبصرہ سے ہوا ہے۔ پھر اردو کی پہلی تنقیدی کتاب (مولانا) حالی کی تصنیف 'مقدمہ شعر و شاعری' کے جدید ایڈیشن پر امیر اللہ شاہین کا ایک مختصر سا تبصرہ ہے۔ ان دو تبصروں کے بعد تیسرا

مفصل تبصرہ علامہ شبلی نعمانی کی تصنیف 'موازنۂ انیس و دبیر' سے متعلق ہے، اور اتفاق یہ ہے کہ مکتبہ جامعہ کے معیاری ادب کی اشاعت کے سلسلہ میں بھی اس کتاب کا نمبر تیسرا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ 'موازنۂ انیس و دبیر' کا کوئی جواب نہیں۔ اس میں میر انیس کے فنی محاسن اور مرزا دبیر کی شعری کمزوریوں کا مدلل بیان ہے۔ اس کے بعد 'دیوان درد' مرتبہ رشید حسن خاں سے متعلق ڈاکٹر وحید اختر کا ایک مفصل اور جامع تبصرہ ہے۔ موصوف نے 'خواجہ میر درد؛ تصوف اور شاعری' کے عنوان سے تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے۔ ایک ذہین نقاد، اچھے شاعر (نظم نگار و مرثیہ نگار) اور علم تصوف کے واقف کار ہیں۔ اس تبصرہ میں ڈاکٹر وحید اختر نے رشید حسن خان پر جارحانہ تنقید بھی کی ہے، مثلاً ان کا یہ قول کہ:

جس طرح منفی تحقیق کو رشید حسن خاں تحقیقی ادب اور تمام علوم پر فوقیت دیتے ہیں اسے علم سمجھنا بذات خود علم کی عزت افزائی نہیں۔ اگر علم کسی مخطوطے کو نقل کرنے کا نام ہے تو ہر پروف ریڈر علم کے سب سے بلند درجے پر فائز ہو سکتا ہے۔ اگر علم کرم خوردہ کاغذوں کی بو میں لذت تلاش کرتا ہے تو رڈی کا ہر بیوپاری اگر قسمت یاوری کرے تو محقق اعظم بن سکتا ہے۔
(صفحہ ۹۵-۹۶)

آگے چل کر ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

رشید حسن خان نے دردؔ کی تصانیف کو سمجھنے سمجھانے کی سرے سے کوشش ہی نہیں کی۔ شاید اس لیے کہ تصوف کو سمجھنے کے لیے جس مبلغ علم کی ضرورت ہے وہ مخطوطہ شناسی سے ہٹ کر بھی بہت کچھ جاننے کا تقاضا کرتا ہے۔ درد کی متصوفانہ شاعری کے متعلق جو ارشادات عالیہ ۸ صفحات کے سرسری اور سطحی تعارف میں بکھرے ہوئے ہیں، اس سے میرے اندیشے کی توثیق ہوتی ہے۔ (صفحہ ۹۷)

رشید حسن خاں اپنی مرتبہ یا مدونہ کتابوں کے آخر میں فرہنگ بھی منسلک کرتے ہیں۔ ڈاکٹر وحید اختر اس بارے میں بھی یوں رقم طراز ہیں:

رشید حسن خاں نے اس قسم کی فرہنگیں اپنی دوسری تصانیف کے ساتھ بھی منسلک کی ہیں۔ ایک محقق کو کم از کم اتنا علم ہونا ہی چاہئے کہ لغت اور فرہنگ میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ فرہنگ میں وہ معنی دیے جاتے ہیں جو کتاب کے متن سے موافقت رکھتے ہوں نہ کہ ہر معنی۔ (صفحہ ۹۹)

محقق رشید حسن خاں کے متعلق ایسی ناقدانہ تحریریں بہت کم پڑھنے کو ملیں گی۔ اکثر محققین و ناقدین تو ان کی مدح سرائی میں گل ریز ہیں۔

(مولانا) عبدالحلیم شرر ایک بلند مرتبہ ادیب اور ناول نگار ہونے کے ساتھ تاریخ داں اور سوانح نگار بھی تھے۔ ان کی ایک بہترین کتاب 'ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ' ہے، جسے مختصراً 'گزشتہ لکھنؤ' کا نام دیا گیا۔ اس کی تصحیح کا کام رشید حسن خاں نے انجام دیا اور اس پر ایک مفصل ابتدائیہ بھی لکھا ہے۔ جدید ایڈیشن مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی جانب سے شائع ہوا۔ اس نئے ایڈیشن پر (مولانا) عبدالماجد دریابادی اور عبداللطیف اعظمی نے تبصرہ لکھ کر ریویو کا حق ادا کیا ہے۔ ان کے معتدل عالمانہ تبصرے عبدالحلیم شرر کی خوبیوں کو بھی واضح کرتے ہیں اور رشید حسن خان کی لغزشوں کو بھی بیان کرتے ہیں۔

علامہ شبلی نعمانی ایک جید عالم، سیرت و سوانح نگار، مؤرخ، متکلم، ادیب، نقاد، شاعر، انشاء پرداز، مضمون نگار اور خدا معلوم کن کن خوبیوں کے جامع تھے۔ رشید حسن خاں نے علامہ شبلی کے 25 قابل قدر مضامین کو منتخب کیا اور اسے 'انتخاب مضامین شبلی' کا نام دیا۔ کتاب کے آغاز میں فاضل مرتب نے علامہ شبلی کا ایک تعارف نامہ بھی رقم کیا ہے۔ اس کتاب کو مکتبہ جامعہ نے بڑے اہتمام سے شائع کیا۔ علامہ شبلی سے متعلق کتاب اور (مولانا) عبدالماجد دریابادی کا اتنا مختصر اور لازمی سا تبصرہ طبیعت کو تشنہ چھوڑ گیا۔ ہاں محمود سروش کا تبصرہ اچھا ہے۔

رشید حسن خاں کی مرتب کردہ ایک اہم کتاب 'انتخاب ناسخ' ہے جسے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نے شائع کیا ہے۔ کتاب کے آغاز میں فاضل مرتب نے جو گراں قدر تعارفی مقدمہ لکھا ہے وہ بغور مطالعہ کا تقاضا کرتا ہے۔ اس کتاب پر رشید نعمانی کے علاوہ ڈاکٹر عبدالحق اور ڈاکٹر گیان چند جین نے بڑا جامع اور مہذب تبصرہ کیا ہے اور کتاب کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے ساتھ مرتب کی محنت وکاوش کی بھی تعریف کی ہے۔ ڈاکٹر عبدالحق مرتب کی حق گوئی،

محنت و ریاضت ، صاف گوئی اور قوتِ احتساب کا ذکر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

انہیں جاں فروشی وجاں بازی کے آبائی پیشے کی تیغ جوہر وار تو وراثت میں نہ ملی۔ ہاں فولاد کا قلم ضرور ملا۔ اسی قلم کی گرفت میں اردو تحقیق میں صالح وصحت مند رجحان پیدا کرنے میں پیش رفت کیا ہے۔ان کا مطالعہ عمیق اور وسیع ہے۔(صفحہ ۱۲۹)

ڈاکٹر گیان چند جین نے فاضل مرتب کے طویل مقدمہ کے بارے میں لکھا ہے کہ:

یہ مقدمہ تنقید اور تحقیق دونوں اعتبار سے معرکہ آرا ہے۔ رشید حسن خاں اب تک محقق کی حیثیت سے مشہور تھے۔ اس مقدمے میں انہوں نے تنقید کی داد بھی دی ہے اور حق یہ ہے کہ حق ادا کر دیا ہے۔(صفحہ ۱۳۰)

رشید حسن خاں کی کتاب 'اردو املا' ایک مبسوط اور معرکۃ الآراء کتاب ہے۔ اردو نویسی اور متعلقات املا میں تغیر وتبدل ایسا موضوع ہے جس پر بہت بحث ہو چکی ہے اور ہوتی رہے گی۔ معیار ومیزان میں رشید حسن خاں کی ممتاز اور گراں قدر کتاب 'اردو املا' پر ڈاکٹر عنوان چشتی اور عبداللہ ولی بخش قادری کے جامع تبصرے موجود ہیں، نیز علی جواد زیدی اور سید شہاب الدین دسنوی کے مفصل ریو یو بھی شامل ہیں۔ مجھے قوی امید ہے، انہیں پڑھ کر قاری کے فکر وفہم اور ادبی معلومات میں قیمتی اضافہ ہوگا۔

رشید حسن خاں کی ہر ایک کتاب پر جو تبصرے 'معیار ومیزان' میں شامل ہیں ان کے بارے میں لکھنا یقیناً طوالت کا باعث ہوگا، اس لیے شائقین ادب کو مشورہ دیتا ہوں کہ کتاب 'معیار ومیزان' کا بالاستیعاب مطالعہ کریں۔ اور حافظ صفوان محمد چوہان کے اس جملہ پر میں اپنی گفتگو کا اختتام کرتا ہوں کہ:''ان شاءاللہ یہ کتاب جناب رشید حسن خاں پر ایک ریفرینس بک کے طور پر یاد کی جائے گی''۔

کتاب کی کمپوزنگ کے وقت کمپیوٹر آپریٹر سے کچھ غلطیاں ہو جاتی ہیں، یہ دیدہ زیب خوبصورت کتاب بھی ان عیوب سے مبرا نہیں۔

☆ مبصر کا پتہ: J-31/78 کچی باغ، وارانسی-221001 (یوپی)
Mobile: 9839878316

□□□

فرنگ کا قیدی (تاریخی فکشن)

مصنف: نثار احمد

تبصرہ: محمد اشرف یاسین☆

آزادی ایک بہت بڑی نعمت ہے، جس کا بالکل درست اندازہ وہی شخص لگا سکتا ہے، جو غلام رہ چکا ہو یا پھر قید و بند کی صعوبتوں سے گزر چکا ہو۔ گزشتہ برسوں میں ہم ہندوستانیوں نے حکومتِ ہند کی تشویق اور گزارش پر اپنی اپنی استطاعت کے مطابق پورے ہندوستان میں 'آزادی کا امرت مہا اُتسو' کئی ہفتوں تک بڑے ہی تزک و احتشام سے منایا تھا۔ ہمارے اسلاف نے اسی آزادی کے لیے اپنے جان ومال، زمین جائیداد اور آل و اولاد سمیت بڑی بڑی قربانیاں پیش کی تھیں۔ ان مجاہدین کی بس اتنی سی خواہش تھی کہ

ہمیں بھی یاد رکھیں، جب لکھیں تاریخ گلشن کی
کہ ہم نے بھی لٹایا ہے، چمن میں آشیاں اپنا

مشہور مجاہد آزادی اور وطن کے لیے شہید ہونے والے اشفاق اللہ خان (1927-1900) نے تو اپنی آخری خواہش کا اظہار کرتے ہوئے حسبِ ذیل شعر پڑھا تھا:

کچھ آرزو نہیں، ہے آرزو تو یہ ہے
رکھ دے کوئی ذرا سی، خاکِ وطن کفن میں

تحریکِ آزادی سے وابستہ مجاہدین کی فہرست بہت طویل ہے، جنہوں نے اپنی ذہنی، جسمانی، بدنی، مالی، علمی اور عملی کوششوں سے وطنِ عزیز کو انگریزوں کے پنجۂ استبداد سے آزاد کرانے کے لیے تن من دھن ہر طرح کی قربانیاں پیش کیں۔ انہی میں سے ایک نمایاں نام جعفر تھانیسری (1838-1905) کا بھی ہے۔ اُردو ادب میں جعفر تھانیسری اپنی خودنوشت سوانح حیات 'کالا پانی المعروف بہ تواریخِ عجیب'

صفحات: 140 قیمت:-/275 اشاعت:2022
ISBN 978-93-5491-509-3
ناشر: ڈائرکٹر نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا، 5 نہرو بھون، انسٹی ٹیوشنل ایریا-II، وسنت کنج، نئی دہلی-110070

کی وجہ سے جانے جاتے ہیں۔ برطانیہ کے خلاف غداری کے الزامات کے تحت تقریباً بیس سال تک انڈمان جزائر میں قید رہنے کے بعد، جنوری 1866 میں وطن واپس لوٹنے والے جعفر تھانیسری نے اسے تحریر کیا تھا۔ جبکہ یہ خودنوشت پہلی مرتبہ 1866 میں زیورِ طباعت سے آراستہ ہوئی۔ اس ناول کے ہیرو ہندوستان کے یہی عظیم مجاہدِ آزادی، سپوتِ ہند جعفر تھانیسری ہیں۔ اس کا موضوع تحریکِ آزادی کی جدوجہد ہے۔

'فرنگ کا قیدی' نثار احمد کا پہلا ناول ہے۔ اس سے پہلے بھی انہوں نے 'شب جائے کہ من بودم' کے عنوان سے اپنا پہلا افسانوی مجموعہ ترتیب دیا تھا اور 'حروفِ آگہی' کے نام سے ان کے مضامین کا مجموعہ زیرِ طبع ہے۔ لیکن بنیادی طور پر اشاعت میں اولیت اسی ناول کو حاصل ہے۔

اس کتاب کا نام سامنے آتے ہی سب سے پہلے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ہندوستان میں ہی غیر ملکیوں ولندیزی، پُرتگالی، غلامان، خلجی، تغلق، سکندر اعظم، سید، لودھی، افغانی، مغل اور انگریز وغیرہ کے تسلط یا پھر لوٹ مار کی کیا وجہ تھی؟ اس کا جواب فاضل ناول نگار نے ہندوستان کی جغرافیائی حدود کو قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

''ملک ہندوستان کا دوسرے ملکوں میں بڑا شہرہ تھا، آباد و غیر آباد خرابے کی خلقت اس ملک کی اور کھینچی چلی آتی تھی۔ اسے جنوب اور مشرق سے سمندر نے گھیر رکھا ہے، شمال میں دور تک کوہستانی سلسلہ دراز ہوتا جاتا ہے، موسم کا اعتدال بہت حد تک اس برفانی چوٹیوں کی رہینِ منت ہے، مغرب میں براعظم ایشیا کے دیگر ممالک آباد ہیں، یہاں کے معتدل موسم گرم اور خوشگوار آب وہوا نے ہمیشہ لوگوں کو لبھایا اور غیر ملکی اس پر چڑھ دوڑے۔''

جعفر کی اسیری کی روداد نہایت جذباتی، غم زدہ کرنے والی اور حزنیہ ہے۔ جعفر کو کسی مخبر کی مخبری پر گرفتار کرکے انڈمان کے غیر آباد جزیرے پر بھیج دیا گیا تھا۔ فرنگیوں نے ہندوستانی باغیوں کو انڈمان کے اس غیر آباد جزیرے میں کیوں بسایا تھا؟ اس کی وجہ اور علت بتاتے ہوئے ناول نگار نے لکھا ہے:

''انڈمان کے چھوٹے چھوٹے جزیرے دور سے بکھرے ہوئے رائی کے دانے معلوم ہوتے تھے، یہ چھوٹے چھوٹے پہاڑی ٹیلے تھے جن پر کچھ خلق خدا کا بسیرا تھا، باہری دنیا سے بے نیاز یہاں کے جنگلی باشندے اپنے علاقے میں باہری مداخلت برداشت نہ کرتے تھے۔... انڈمان کے اس غیر آباد حصے پر کالا پانی نامی قید خانہ تھا جہاں خطرناک سمجھے جانے والے قیدیوں کو مقید رکھا جاتا تھا، جو ایک بار اس غیر آباد جزیرے میں آجائے اس کا کوئی پرسان حال نہ ہوتا تھا، جعفر انگریز مشنری کی نظر میں ایک خطرناک مجرم تھا اس پر بغاوت کا الزام تھا، وہی بغاوت جس نے انگریزی حکام کی چولیں ہلا دیں، جس بغاوت پر وطن عزیز کی آزادی کی بنیاد پڑنی تھی۔ جعفر اس بغاوت کے سرخیلوں میں تھا، بغاوت کا الزام اس کے سر کا تاج تھا۔ آزادی وطن کے بے شمار ایسے متوالے تھے جو انگریزی ظلم و تشدد کے سامنے ڈٹ گئے، سینکڑوں لوگ جام شہادت نوش کر گئے اور تاریخ کے صفحات میں گم ہو گئے۔''

لسانی نقطۂ نظر سے ناول کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں 'بٹوہی' (مسافر) اور 'بیار' (ہوا) جیسے جو بھی الفاظ اس ناول میں استعمال ہوئے ہیں، ان کی روشنی میں ان الفاظ کا تمدنی، شہری، قصباتی اور لسانیاتی مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔

عصرِ حاضر کے ادبی منظر نامے پر اس طرح کی کئی کتابیں لکھی گئیں ہیں۔ صرف این بی ٹی (نیشنل بُک ٹرسٹ، قیام 1957) سے ہی اس اسکیم کے تحت اس طرح کی متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اُن میں انظر عقیل کی کتاب 'بابا مجنوں شاہ ملنگ مداری (1788-1731)، برصغیر کی جنگ آزادی کا ایک گم نام مجاہد'، نہاں رباب کی کتاب 'مظہر الحق (1930-1866)، تحریک آزادی کا فراموش کردہ قائد'، صفیہ اختر سبحانی کی کتاب 'ہائے کیا لوگ تھے جو دام اجل میں آئے'، تنزیل عالم بدوی کی کتاب 'آئینِ ہند اور دستور ساز اسمبلی کے مباحثے، قومی زبان کے حوالے سے' وغیرہ خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ جبکہ آزادی کے فراموش کردہ ان مجاہدین پر 'منی کرنیکا: دا کوئین آف جھانسی' (Manikarnika: The Queen of Jhansi) اور 'ساورکر' (Swatantra Veer Savarkar) وغیرہ جیسی فلمیں بھی بنائی گئی ہیں۔

جعفر تھانیسری کا تعلق پنجاب تھانیسر سے تھا لیکن ان کے

معاون مجاہدین'امیر خان'، 'مبارک علی اور تبارک علی' صادق پور (پٹنہ) کے تھے۔ 'صادق پور' محلہ پٹنہ میں گاندھی میدان کے بالکل قریب ہی تھا۔ یہ زمین اب پٹنہ ایم سی ڈی کے قبضے میں ہے اور آج اسی جگہ پر سرکاری بس اسٹینڈ ہے۔ ممبر پارلیمنٹ اور سابق سفیر برائے ایران ڈاکٹر تاراچند (1888-1973) نے اپنی کتاب 'جنگ آزادی 1857' (اشاعت 1958) میں صفحہ نمبر 117 سے 134 پر 'بغاوت کی علامتیں' کے عنوان سے علمائے صادق پور کی قربانیوں کا تذکرہ کیا ہے اور 2 اپریل 2025 کو کانگریس کے لیڈر گوروگگوئی (1982) نے بھی پارلیمنٹ میں وقف بل پر گفتگو کرتے ہوئے دولاکھ علمائے کرام مجاہدینِ وطن کی قربانیوں کو سراہا۔

جب مجاہدینِ آزادی کو کالا پانی کی سزا ہوئی تھی تو ان کو ممبئی ہی سے وہاں لے جایا گیا تھا، انہی قیدیوں میں جعفر تھانیسری بھی تھے۔ ممبئی سے انڈمان کی طرف کوچ کرتے ہوئے بحری بیڑوں کی تفصیل درج کرتے ہوئے کمال کی منظر نگاری، جزئیات نگاری در آئی ہے۔ اس سے تخلیق میں آمد کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے۔ عروس البلاد ممبئی کی تاریخ، جغرافیہ اور اس عظیم الشان شہر کے بمبئی سے ممبئی ہونے کی وجہ تسمیہ سے کے بارے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''بمبئی بھارت کے جنوب مغرب کے ساحل پر واقع ایک عظیم شہر ہے۔ غیر ملکوں میں اس کا بڑا شہرہ ہے۔ یہاں کی چوڑی سڑکیں، بلند و بالا عمارتیں، یہاں کی تہذیبی و تجارتی سرگرمیاں، اسے ہندوستان کے دوسرے شہروں سے ممتاز کرتی ہیں۔ تیسری صدی قبل مسیح میں موریہ عہد کے بادشاہوں نے ہندو، بدھ ثقافت کی حیثیت سے اس شہر کو آباد کیا تھا۔ عہد وسطی میں سوا سو سالوں تک یہ شہر پرتگالیوں کے قبضے میں رہا۔ یہ شہر سات جزیروں پر مشتمل تھا، اس کے کچھ حصوں پر ستواہنا کے حکمرانوں کا قبضہ رہا۔ بعد میں سلہارا خاندان کے بادشاہوں نے اس پر راج کیا۔ سولہویں صدی میں پرتگالیوں نے یہ شہر چارلس دوم کو تحفہ میں دے دیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیرِ نگیں آنے کے بعد ساتوں جزیروں کو یکجا کر دیا گیا، تب سے اس کا نام بمبئی ہوگیا۔ چھ سو مربع کلومیٹر میں واقع یہ شہر اٹھارہویں صدی کے وسط میں تجارتی مرکز کی حیثیت سے ابھرا۔ ایک گہری قدرتی بندرگاہ اس شہر میں موجود ہے جہاں دنیا بھر سے جہاز کی آمدورفت رہتی ہے۔'' (صفحہ نمبر، 90)

مجاہدینِ ہند کی مجاہدانہ صفات کو تخلیقی پیراہن عطا کرتے ہوئے ناول نگار نے جن تلمیحات، تشبیہات و استعارات وغیرہ کا استعمال کیا ہے، انہیں پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مجاہدین کی جملہ صفات اور اللہ کی نظر میں مجاہدین کی قدر و منزلت، اہمیت اور وقعت، فضیلت اور برتری سے واقفیت رکھتے ہیں۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید (سورۃ العادیات 5-1) میں مجاہدین کے گھوڑوں کے سُموں اور کُھروں کی قسم تک کھائی ہے۔ جعفر کے گھوڑے کی ٹاپ سے پیدا ہونے والی آواز کو جن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے اس میں قافیہ پیمائی، عبارت آرائی اور تصنع موجود ہے، جو کہ فکشن کا حسن ہے۔

ناول کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ نثار احمد نے اپنی اس تخلیقی افسانوی نثر کے لیے بہترین ریسرچ کیا ہے۔ اس کتاب میں تاریخ اور تخلیق کے درمیان دوری کو برقرار رکھنے میں وہ بہت حد تک کامیاب نظر آتے ہیں۔ یقیناً انہوں نے یہ کام پوری ایمانداری اور محنت سے انجام دیا ہے۔ دہلی یونیورسٹی کے موجودہ صدر شعبۂ اُردو جناب ابوبکر عباد (پ:1968) نے اس ناول کے بارے میں کہا ہے:

''یہ بہت ہی خوش آئند اور قابل مبارکباد بات ہے کہ مدرسے سے فارغین طلبا نہ صرف انتظامی امور بلکہ عصری علوم کے مختلف شعبوں میں کارہائے نمایاں انجام دے رہے ہیں۔''

ناول کا اختتامیہ قومی یکجہتی کو فروغ دینے والا ہے۔ اس طرح کے بیانیے سے باشندگانِ وطن کے درمیان آپس میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی، جمہوری اقدار کی پذیرائی، رواداری، امن و آشتی، پُرامن بقائے باہم وغیرہ جیسے عناصر کو تقویت ملتی ہے۔

☆ مبصر کا پتہ: (ریسرچ اسکالر، دہلی یونیورسٹی، دہلی)
E-224، تھرڈ فلور، شاہین باغ، نزد اوکھلا موڈرن پبلک اسکول، ابوالفضل انکلیو II، جامعہ نگر، نئی دہلی-110025
Mobile: 8750835700

❑❑❑

عصمت چغتائی کا افسانوی فن

مصنف: ڈاکٹر محمد دانش غنی

تبصرہ: ڈاکٹر شاہین خان☆

ڈاکٹر محمد دانش غنی نے عصمت چغتائی کے افسانوی فن کو ایک تسلسل کے ساتھ پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ کتاب کے بغور مطالعے سے یہ احساس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر محمد دانش غنی کا مزاج تحقیق کی بہ نسبت تنقید کی طرف زیادہ ہے۔ کتاب کے کل سات مضامین یقینی طور پر تنقید کے زمرے میں آتے ہیں لیکن ان مضامین میں تحقیق کے جلوے بھی نمایاں ہیں۔ خود مصنف نے بھی 'حرفِ دانش' میں یہ اعتراف کیا ہے کہ یہ کتاب عصمت چغتائی کی افسانہ نگاری کے فن کو سمجھنے کی ایک معمولی کوشش ہے۔

زیرِ نظر کتاب 'عصمت چغتائی کا افسانوی فن' میں شامل سبھی مضامین اپنی نوعیت کے اعتبار سے پُر اثر ہیں۔ 'عصمت چغتائی کے افسانوں کا مطالعہ: عہد بہ عہد' ایک اہم موضوع ہے اور بعض اہم تنقیدی آرا سے ناواقفیت یا چشم پوشی کے باوجود مصنف نے اس موضوع پر بڑی محنت کی ہے۔ اس لیے یہ مضمون معلوماتی بھی ہے اور مفید بھی۔ 'عصمت چغتائی کے افسانوں کا تنقیدی جائزہ' میں عصمت کے ذہنی اور فنی سفر کا جو جائزہ پیش کیا گیا ہے کافی اہم ہے، اگرچہ اس میں مزید وسعت اور تنوع کی گنجائش تھی۔ البتہ 'عصمت چغتائی کے افسانوں میں عورت کی نفسیات' ایسا لگتا ہے کہ سرسری طور پر لکھا گیا مضمون ہے جس میں مطالعے کی گہرائی کم محسوس ہوتی ہے۔

'عصمت چغتائی کے منتخب افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ' کتاب کا چوتھا مضمون ہے جس میں عصمت چغتائی کے منتخب افسانوں کے تجزیے شامل ہیں۔ یہ مضمون وضاحتی انداز میں سلجھا ہوا اور قابلِ تعریف ہے۔ 'عصمت چغتائی کے اہم معاصرین' اپنی خصوصیت کے لحاظ سے ایک اہم مضمون ہے جس میں عصمت کے معاصرین مثلاً سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، اوپیندر ناتھ اشک اور احمد ندیم قاسمی سے عصمت چغتائی کا تقابلی اور تنقیدی مطالعہ پیش کیا گیا ہے جو ڈاکٹر محمد دانش غنی کی ایک اچھی کوشش ہے۔ سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، اوپیندر ناتھ اشک، احمد ندیم قاسمی اور عصمت چغتائی کی ادبی رفاقتیں اردو افسانے کی ایک اہم لڑی ہے جس میں شامل ہر ایک پھول نے اپنی اپنی انفرادیت کے ساتھ اردو ادب کو اپنی خوشبوؤں سے معطر کیا۔ اردو افسانوں کے ان ستونوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے سماج کے زخموں کو کریدا ہے اور انسانی نفسیات کی گہرائیوں کو چھوا۔ ان کی رفاقت ایک ایسی ادبی ہم آہنگی کی مثال ہے جو مختلف نقطہ ہائے نظر کو یکجا کر کے ایک مکمل سماجی اور نفسیاتی تصویر پیش کرتی ہے۔ آج بھی ان کی تحریریں نہ صرف ادبی بصیرت فراہم کرتی ہیں بلکہ سماجی اصلاح کے لیے ایک آواز بھی ہیں۔ مذکورہ مضمون میں چھ عظیم افسانہ نگاروں کے مزاج وطبیعت اور شخصی احوال میں موازنہ کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے جبکہ موضوع، رجحان، فکری روایت یا ان تخلیق کاروں کے فکر وفن کے وسیع تر تناظر میں تنقیدی مطالعے کا باہمی حوالہ بھی ہیں۔

'عصمت چغتائی کی عصری معنویت' عصرِ حاضر میں عصمت کی فکری اور فنی انفرادیت کو واضح کرتا ہے۔ مصنف کے مطابق عصمت چغتائی کے افسانوں کا انفرادو اختصاص آج بھی برقرار ہے۔ ان کے افسانے اب بھی آج ہی کے افسانے محسوس ہوتے ہیں۔ انہوں نے جو موضوعات چنے تھے اور جن مسائل کو اٹھایا تھا ان کی شدت وحرارت آج بھی جوں کی توں پائی جاتی ہے۔ اس لیے عصمت چغتائی کے افسانوں کی اہمیت اکیسویں صدی میں بھی محسوس ہوتی رہے گی۔ انہوں نے اپنی سوچ اور تخلیقی جوت سے موجودہ صدی کی تاریکیوں میں بھی ایک روشنی سی کررکھی ہے۔ میں مصنف کے اس خیال کی تائید کرتی ہوں۔

زیرِ نظر کتاب کا آخری مضمون 'اردو افسانے میں عصمت چغتائی کا مقام' ہے جس میں مصنف نے عصمت چغتائی کے فن، مواد، تکنیک اور اندازِ بیان کے ذریعے اردو افسانے میں ان

صفحات: 224 قیمت: -/300 اشاعت: 2025
ISBN 978-93-343-3384-8
ناشر: ثنا پبلی کیشنز، کامٹی، ناگپور-441001 (مہاراشٹر)
Mobile: 9595559073

کے مقام ومرتبہ کا تعین کیا ہے۔

اس مجموعہ میں شامل تمام مضامین کا اندازِ بیان تجزیاتی اور مدلل ہے۔ اس لیے ابہام کی گنجائش بہت کم ہے اور عصمت چغتائی کی افسانہ نگاری کے متعلق بیشتر نکات واضح ہوجاتے ہیں۔ اسلوب میں بھی دلکشی ہے۔ اردو ادب کے باذوق قارئین کو اس کتاب کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔

☆ مبصر کا پتہ: شعبہ اردو، وسنت راؤ نائک گورنمنٹ انسٹی ٹیوٹ آف آرٹس اینڈ سوشل سائنسز، ناگپور۔ (مہاراشٹر)
Mobile: 8087239676

□□□

حدوں سے آگے (افسانے)

مصنف: ڈاکٹر محمد مستمر

تبصرہ: سعید اختر اعظمی☆

فرائیڈ کے نظریہ جنس سے قطع نظر، یہ ایک فطری جذبہ ہے۔ انسان کو بقائے حیات کے لیے اشیائے خوردونوش کے ساتھ 'جنسی خوراک' بھی چاہیے جس کی تکمیل جائز وناجائز دونوں طریقوں سے کی جاسکتی ہے۔ سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی اور واجدہ تبسم سمیت کئی قلم کار اسی سماجی ضرورت کو اپنے زاویے سے دیکھنے اور سامنے لانے کے لیے کوشاں رہے ہیں۔ عہد حاضر میں جنسی بے راہ روی عام ہونے کا سبب مغربی تہذیب کی پیروی ہے جس کا مشاہدہ عوام کے شانہ بہ شانہ ادیب بھی کرتا ہے۔ ڈاکٹر محمد مستمر نے بھی مغرب کی اندھی تقلید میں اخلاقیات کی حدود توڑنے والوں اور 'عدم تسکین' سے نبرد آزما افراد کی نفسیات کو سمجھنے کی سعی کی ہے۔ ان کا مشاہدہ قوی ہے اور وہ جذبات کی ترسیل سے بھی واقف ہیں۔ اسی لیے ان کے افسانے قاری کے ذہن تک رسائی حاصل کرنے میں خاطر خواہ کامیاب نظر آتے ہیں۔

صفحات: 176 قیمت:-/250 اشاعت:2024
ناشر: وانیہ بکس اینڈ پبلشرز، نئی دہلی-110002
مصنف سے رابطہ:8920860709

'حدوں سے آگے' ڈاکٹر محمد مستمر (استاذ ذاکر حسین کالج، دہلی) کا اولین فکشن بیانیہ ہے جس میں تقریباً ایک درجن افسانوں کی شمولیت ہے۔ اس کے بیشتر افسانوں کا موضوع 'جنس' ہے جس میں ان کا لکھا ہوا پہلا افسانہ 'شاخ مرجھا گئی' بھی ہے جو اس مجموعہ کے آخر میں ہے۔ سرورق افسانہ 'حدوں سے آگے' کتیا کے بطن سے نوزائیدہ کی ولادت، قیمت کی ادائی کے بعد بتر افیملی کے گھر کا حصہ بننے اور ان کے شباب کی دہلیز پہ قدم رکھنے والی بیٹی کی اس سے انسیت کو سامنے لاتا ہے۔ وہ اسے ٹیڈی بیئر کا بدل بنالیتی ہے اور ہم آغوشی کا لطف لیتے لیتے قربت کی لذت کوشی تک جا پہنچتی ہے۔ 'چولا' باکرہ کی ازدواجی لطف اندوزی کے بعد 'جمال کی دوشیزگی نکھرنے' کا اعلامیہ ہے جس پر وہ خود بھی حیران ہوجاتی ہے۔ 'نا آسودگی' بس اسٹاپ پہ موجود مجذوب کا احوال ہے جس کے بارے میں یہ خبر گرم ہے کہ یا تو وہ پاگل ہے یا کوئی سی آئی ڈی، لیکن جب وہ ہیجانی کیفیت کے ساتھ جلق لگا تا دکھائی دیتا ہے تو اس کے 'حساس مرد' ہونے کا راز طشت از بام ہوجاتا ہے۔ 'تحریک' سرد مزاج ہم پیشہ کے اثراتِ بد کا شاخسانہ ہے جس کی بدولت ایک سہاگن کے اندر 'جنسی سرد مہری' عود کر آئی۔ جب اس کی منتقلی دوسرے علاقہ میں ہوئی تو نئی ہم پیشہ خواتین کی صحبت نے خوابیدہ جذبوں میں نئے جوش وولولے کو بیدار کردیا۔ 'امتزاج' ماہر جنسیات کے پاس آنے والے ایک شخص کا المیہ ہے جو جنسی تسکین سے محروم ہے۔ ازدواجی زندگی کے ابتدائی ایام ہنسی خوشی گزرتے ہیں پھر اس کی بیوی مختلف بہانوں سے جنسی عمل سے اعراض برتنے لگتی ہے۔ وہ اس مسئلہ کو شریک حیات کی بڑی بہن کے سامنے رکھتا ہے جس کا اثر چند دنوں تک قائم رہتا ہے، پھر وہی سرد مہری کا عالم۔ بیوی کی محبت اور سماجی رواداری کے سبب وہ اس سے الگ نہیں ہوسکتا اور 'آختہ' ہونا چاہتا ہے۔ ماہر جنسیات کے منع کرنے کے بعد وہ واپس چلا جاتا ہے اور دوسال بعد پاگل خانے میں اس سے ملاقات ہوتی ہے۔ 'شاخ مرجھا گئی' ماموں زاد پھوپھی زاد کی شادی کے دوسرے دن فریق ثانی کا فریق اول سے طلاق لینے پہ زور اور ہنگامہ آرائی پہ محیط ہے۔ وہ وجہ بتاتی ہے کہ 'ندی کے دہانے پہ پانی کی

دھارگری ہی نہیں'۔ان نصف درجن افسانوں میں 'جنس' سماجی المیہ کے طور پر سامنے آتا ہے۔کہیں مغربی تہذیب کی بے راہ روی ہے تو کہیں مجازی خدا سے فطری تسکین پہ فرحت و انبساط کا احساس۔کہیں دنیاوی معاملات تج دینے کے باوجود جنسی جبلت کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کی مجبوری ہے تو کہیں صحبت یاراں کی سرد مہری و جوش کے متنوع اثرات۔کہیں جنس مخالف کے حرارتِ بدن سے انسلاک نہ ہونے کے سبب دیوانگی کا نقطہ عروج ہے تو کہیں شادی کے اولین لمحات کی عدم سرشاری پہ رشتہ توڑ دینے کا فیصلہ۔

'کل جُگ میں' بیٹے کے انتقال ناگہانی کے بعد بہو کو بیٹی کا درجہ دے کر مزید تعلیم کے حصول کے لیے پیش قدمی، دوسری شادی اور وراثت میں تیسری بیٹی مان کر حصہ داری ایسا قدم ہے جو ہر 'قانونی باپ' کو اُٹھانا چاہیے۔'قدموں کے نشاں' تدریس کے شعبہ میں نیک نیتی، ایمانداری اور بے ایمانوں کے سامنے ڈٹ جانے کے مسائل کا آئینہ ہے جو دشمنی اور دور دراز علاقوں میں منتقلی کی صورت میں سامنے آتا ہے۔'میرے استاد' ایک نمونہ صفت معلم کے شب و روز کا درپن ہے جس نے اپنی زندگی طے شدہ اصولوں کی پاس داری کرتے ہوئے گزاری۔'میرا قصور' عصرِ رواں میں امت مسلمہ کے افراد کے ساتھ حکومت کی زیادتیوں کی کریہہ تصویر ہے جس کے رنگ دن بہ دن گہرے ہوتے جارہے ہیں۔یہ چار افسانے جنس سے ہٹ کر 'موضوع دیگر' کے حوالے کو معتبر کرتے ہیں۔

فکشن کو توانائی بخشنے والے یہ دونوں پہلو کسی حد تک 'موثر بن جاتے اگر بعض 'طول طویل وضاحت' نے کہیں کہیں بیڑہ نہ غرق کر دیا ہوتا (اس کی واضح مثال صفحہ 85 کی آخری تین سطروں سے لے کر صفحہ 91 کی ماقبل چار سطور تک مڈ ڈے میل کی تفصیلات، کھانے کا مینو، اخراجات اور خطابت سے پُرمکتوب ہے) افسانہ نگار نے کسی قسم کے 'دیباچہ' سے گریز کیا ہے جبکہ ڈاکٹر ابراہیم افسر سے 17 صفحات کی 'پس نوشت' لکھوا کر خود کو 'اکیسویں صدی کا منفرد افسانہ نگار' کہلوایا ہے۔ ادھار کی بیساکھی کے بجائے اگر اپنی افسانہ نگاری اور موضوع کے انتخاب کے حوالے سے ایک دو صفحات تحریر کر دیے جاتے تو یہ قلم کار اور قاری دونوں کے حق میں مفید ہوتا۔ویسے جنس کی تصویر کشی میں لذت کی مقدار کتنی ہے یہ قاری پہ چھوڑ دیجیے، کیونکہ وہ قلم کار و ناقد کے مقابلے میں فیصلہ کا اولین حق رکھتا ہے۔

☆ مبصر سے رابطہ: ریاض (سعودی عرب)
Mobile: +966598300320

□□□

پروفیسر شہاب الدین ثاقب کی تازہ کتاب
تحقیقی نگارشات
(تحقیقی وتنقیدی مضامین)
صفحات: 424 قیمت:-/800 اشاعت:2026
ISBN 978-93-90579-55-6

بنگال میں ہندوؤں کی فارسی خدمات
مصنف: پروفیسر سیّد امام الدین
صفحات:416 (مجلد)، قیمت:-/600، اشاعت:2025
ISBN 978-93-90579-54-9

خطوطِ شبلی [بنام خواتینِ فیضی]
مؤلف: محمد امین زبیری
مرتب: ڈاکٹر شمس بدایونی
صفحات:258 (مجلد)، قیمت:-/300، اشاعت:2020
ISBN 978-81-944111-8-5

اُردو تنقید پر مغربی تنقید کے اثرات
(ترمیم واضافے کے ساتھ)
مصنف: ڈاکٹر سیّد تنویر حسین
ISBN 978-93-90579-98-3
رابطہ: اردو بک ریویو، دریا گنج، نئی دہلی
Tel. 011-44753890 / 9953630788

اعلان داخلہ/ برائے تعلیمی سال ۲۷-۲۰۲۶/ داخلہ یتیم اور غیر یتیم طلباء

لڑکیوں کے لئے جدید اور مکمل اسلامی طرز تعلیم سے مزین قومی سطح کا معیاری رہائشی (Residential) ادارہ

40 سالہ خدمات

مسلم لڑکیوں کا یتیم خانہ گیا

THE GAYA MUSLIM GIRLS' ORPHANAGE

ہماری نمایاں خصوصیات ● اسلامی ماحول میں کم خرچ میں ● بہتر تعلیم و تربیت ● برتر نمبر اور روشن مستقبل کے لئے جلد سے جلد اپنی بچیوں کا داخلہ کرائیں اور دنیا و آخرت بنائیں۔ **تعلیم** ● پانچ زبانوں میں مع قرآن اور اسلامیات کے ساتھ میٹرک تک معیاری تعلیم ● زبان: انگریزی، اردو، ہندی، عربی، فارسی مع بہار بورڈ **سلیبس (B.S.E.B)** ● ادارے کے احاطے (Campus) میں پردہ (Purdah) میں رہ کر درجہ نرسری (Nursery) تا میٹرک (X) تک کی تعلیم مع ہوم سائنس (امور خانہ داری)، دستکاری میں مہارت اور کمپیوٹر کی تعلیم وغیرہ ● شعبہ حفظ۔ حفظ کے ساتھ ساتھ میٹرک (X) مع ہوم سائنس، سلائی و کٹائی و کمپیوٹر وغیرہ۔ **داخلہ** شعبہ حفظ ● درجہ نرسری اور درجہ اوّل (I) سے درجہ نہم (IX) تک ● ایک ہی احاطے (Campus) میں تعلیم گاہ، اقامت گاہ، نماز کا ہال، طعام گاہ، پارک و کھیل کود کی جگہ وغیرہ۔ اس لئے بچیوں کو کہیں آنا جانا نہیں پڑتا ہے۔ ● ہوادار اور کشادہ کلاس روم اور بہترین دو منزلہ شاندار عمارت مع سولر مشین (Solar Machine)، روشنی، پنکھا اور بجلی وغیرہ۔ ● صحت و صفائی پر خصوصی توجہ، طبی سہولیات اور بہترین تربیت کے ساتھ محفوظ سیکیوریٹی کا نظم ● بچیوں کے لئے لائبریری مع سائنس لیباریٹری (سائنس پریکٹیکل روم) اور کمپیوٹر روم وغیرہ۔ ● ادارے میں ہر جمعرات کے دن ثقافتی پروگرام کا نظم ● باہری طالبات بھی ادارے میں اپنے خرچ پر بورڈنگ میں رہ کر تعلیم حاصل کیا کرتی ہیں۔ ● یتیم اور غیر یتیم بچیوں کا رہنا سہنا، کھانا پینا اور پڑھنا لکھنا ایک ساتھ ہوا کرتا ہے ● مساوات کا مثالی اور اعلیٰ نمونہ ہے۔ ● یتیم بچیوں کی پناہ گاہ کو خود آ کر اپنی آنکھوں سے دیکھیں کہ ادارہ قوم کی یتیم و غیر یتیم بچیوں کی خدمت کس طرح انجام دے رہا ہے۔ ● یتیم بچیوں کی ادارہ کے کیمپس (Campus) ہی میں ''اپنی دکان'' عصر تا قبل نماز مغرب **اخراجات** بوقت داخلہ مجموعی اخراجات: ہوسٹل کی طالبات **6220** روپئے ● بیرونی طالبات۔ تقریباً **560 تا 1400** روپئے ● ماہانہ تعلیمی عطیہ شعبہ نرسری (اطفال) **560** روپئے، شعبہ ابتدائی (درجہ اوّل تا پنجم) **560 تا 820** روپئے ● شعبہ ثانوی (درجہ ششم تا ہشتم) **820 تا 1020** روپئے ● شعبہ اعلیٰ (درجہ نہم تا دہم) **1400** روپئے۔ ● شعبہ حفظ مدت تعلیم پانچ سال **665** روپئے۔ **یادرکھیں** ❶ یتیم طالبات سے کسی طرح کا کوئی خرچ نہیں لیا جاتا ہے۔ سب کچھ مفت (Free) ہے۔ یا یوں کہیئے کہ ایڑی سے لے کر چوٹی تک کا سارا خرچ ادارہ پورا کرتا ہے۔ ❷ ہوسٹل کی طالبات کے طعام فیس کا تعین ماہانہ خرچ کے حساب سے ہوا کرتا ہے۔ ● ماہانہ طعام فیس تقریباً اٹھارہ سو روپئے (Rs. 1800/=) ہوتی ہے۔ ❸ ہر نئے سال میں تجدید داخلہ کرانا ضروری ہے۔ ❹ سرپرست اور طالبات پر ادارہ کے قواعد و ضوابط کی پابندی لازمی ہے۔ ❺ ماہانہ تعلیمی عطیہ، دارالاقامہ فیس (۱۲ ماہ) اور طعام فیس (۱۰ ماہ) کی لی جاتی ہے۔ ❻ بوقت داخلہ آدھار کارڈ کی فوٹو کاپی/ تاریخ پیدائش کا تصدیق نامہ اور اصلی (Original) ٹی۔ سی (T.C) جمع کرنا لازمی ہے۔ ● سرکاری اسکیم کے تحت یہاں سے میٹرک (X) پہلی پوزیشن (فرسٹ ڈویژن) سے پاس کرنے والی طالبات کو دس ہزار (Rs. 10,000) روپئے کا انعام بھی ملا کرتا ہے۔

نوٹ ادارہ کی مختصر تاریخ دستاویزی (Documentary Film) فلم نذر عنایت **You -Tube (Nazr-e-Enayeth)** پر دیکھیں۔

چیک وڈرافٹ اورکوربینکنگ سلپ پرصرف یہ لکھیں - THE GAYA MUSLIM GIRLS' ORPHANAGAE

برائے رابطہ، چیک وڈرافٹ اور منی آرڈر بھیجنے کا پتہ ●Founder & Hon. G. Secretary,THE GAYA MUSLIM GIRLS' ORPHANAGE

At: Kolowna, P.o: Cherki-824237, Distt: Gaya (Bihar) India

●Email:thegayamuslimgirlsorphanage@gmail.Com ● Website: www.gmgo.in 8969435151 ●

Beneficiary Name: THE GAYA MUSLIM GIRLS' ORPHANAGE

Bank A/C No.: 300402010009846

Bank IFSC Code No: UBIN0530042

Bank : UNION BANK OF INDIA (MAIN BRANCH GAYA)

Scan & Pay

نوٹ: بینک میں رقم ٹرانسفر کی تفصیل برائے مہربانی اسکین اینڈ پے (Scan & Pay) یا کسی ذریعہ سے رقم ٹرانسفر کے بعد اسکرین شاٹ (Screen Shot) مع نام و پتہ وہاٹس ایپ نمبر پر وہاٹس ایپ کر دیں تاکہ رسید بھیجی جا سکے۔

وہاٹس ایپ نمبر-7367909126 بانی و اعزازی جنرل سکریٹری اقبال احمد خاں 9934480190

جائزہ اُردو کتب ورسائل

شیعہ سُنّی اتحاد

مصنف: پروفیسر محسن عثمانی ندوی

صفحات: 40، قیمت: -/50، اشاعت: 2026

ناشر: مکتبہ نشانِ راہ، K-6 بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی-25

Mobile: 9899545546

——— از: محمد عارف اقبال

پروفیسر محسن عثمانی ندوی کی تازہ کتاب 'شیعہ سُنّی اتحاد' کا بیشتر حصہ 'سفرنامہ ایران' پر مشتمل ہے۔ پروفیسر صاحب نے ایران کا یہ سفر ستمبر 2006 میں کیا تھا۔ اس سفر میں انہوں نے تہران، قم، اصفہان، مشہد کی سیر کی لیکن اس سفر کا اصل مقصد تہران کی کانفرنس میں شرکت کرنی تھی جس کا موضوع 'مہدویت' تھا۔ اس کانفرنس کے شرکاء میں یورپ و امریکہ کے علاوہ کئی ملکوں کے مندوبین تھے۔ عربوں کی تعداد بھی اچھی خاصی تھی۔ مصنف نے تہران اور دیگر شہروں کی تعریف وتوصیف میں بخل سے کام نہیں لیا ہے۔ تہران کے بارے میں لکھتے ہوئے دلچسپ انداز میں ہندوستان کا ذکر بھی کیا ہے۔ چند جملے دیکھیے:

''نفاستِ تہذیب اور شرافتِ مزاج یہاں لوگوں کی سرشت میں داخل ہے، ہم کئی شہروں میں گئے، ہر جگہ بے حد و حساب صفائی ستھرائی تھی۔ ہندوستان میں زیادہ تر سڑکیں گندی ہوتی ہیں، سڑک کے کنارے لوگ کھڑے ہو کر پیشاب کرتے ہیں اور شہر کے مضافات میں ریلوے لائن کے کنارے حاجاتِ ضروریہ سے فارغ ہوتے رہتے ہیں، یہ قبیح مناظر ہندوستان سے باہر کہیں نہیں پائے جاتے۔ یہ حرکت کلنک کا ٹیکہ ہے اور شرمندگی اور عار کی بات ہے اور اس بات کی علامت ہے کہ ہم تہذیب وشائستگی سے کوسوں دور ہیں اور تعلیم وتمدن کے ستارے اتنی مسافت پر ہیں کہ ان کی روشنی سرعت رفتار کے باوجود یہاں کی فضائے بسیط تک نہیں پہنچی ہے۔ ...''

مصنف نے آگے بھی کچھ لکھا ہے۔ اپنے سفرنامہ میں مصنف کا تجزیاتی انداز اپنوں کو بھی بخشنے کا قائل نہیں۔

فاضل مصنف نے اپنے اس سفر میں بھی شیعہ سُنّی اتحاد کی باتیں کی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ شیعہ سُنّی اتحاد وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ اس اتحاد کے لیے ان کا نکتہ نظر یہ ہے کہ اگر شیعہ حضرات تمام خلفائے راشدین کا احترام کریں اور اپنے بچوں کا نام بھی ان کے نام پر رکھیں، جس طرح سُنّی حضرات اہل بیت کے نام پر بچوں کا نام رکھتے ہیں تو اہل سنّت کو یقین ہوجائے گا کہ شیعہ حضرات صحابہ پر تبرا نہیں کرتے ہیں۔ اور وہ انقلاب آئے گا جس کا فائدہ دونوں طرف کے لوگوں کو پہنچے گا اور پوری ملت سرخرو ہوگی اور قرآن کی اس آیت پر عمل ہوجائے گا:

وعتصموا بحبل الله جميعا و لاتفرقوا یعنی اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے پکڑو اور تفرقہ اندازی نہ کرو۔

ایران کے اس مختصر سفرنامے کی زبان اور اسلوب بڑا دلکش ہے۔ فاضل مصنف کہتے ہیں کہ اتحاد کا حکم منصوص حکم ہے، اس کا علاج صرف ایک ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم سب تاریخ کو نظر انداز کر کے قرآن وسنّت کی طرف رجوع کریں اور اتحاد کا حکم چونکہ منصوص حکم ہے، اس کو برسرِ عمل لانے کی کوشش کریں۔ پروفیسر محسن عثمانی ندوی لکھتے ہیں کہ ''... درحقیقت اہل فارس نے اسلام قبول کر کے کفر کی تاریکیوں کو شکست دی تھی، اس کے بعد یہ سرزمین اسلامی علوم وفنون کا گنجینہ اور گہوارہ بن گئی، نہ صرف فقہ اور قرآن و حدیث میں بلکہ عربی زبان و ادب اور بلاغت میں بھی نامور شخصیتیں اس ملک میں پیدا ہوئیں، عجم کے لالہ زار عربی اسلامی علوم وفنون کے گلابوں سے مہک اٹھے، ایک سے ایک عالم بے بدل، فقیہ بے مثال، محدث بے نظیر اس ملک میں پیدا ہوئے۔

موجودہ ایران — امریکہ اسرائیل جنگ کے پس منظر میں فاضل مصنف لکھتے ہیں:

''مسلمانوں کے باہمی اختلافات تباہ کن ہوسکتے ہیں۔ مسلمانوں کا اتحاد اور شیرازہ بندی ضروری ہے۔ مسلمان ملکوں میں اگر کسی میں دَم خَم ہے تو ایران میں ہے، جس نے نہ صرف اسرائیل کا بلکہ امریکہ جیسے شتر بے مہار کا مقابلہ کیا۔ مسلمانوں کو ایران کا ساتھ دینا چاہیے اور شیعوں کے ساتھ دوستانہ اور برادرانہ

تعلقات قائم کرنا چاہیے۔ شیعہ حضرات بعض اختلافی مسائل کے باوجود اہل ایمان میں داخل ہیں اور حدیث میں ہے المومنون اخوۃ (مومن آپس میں بھائی ہیں)۔ (پیش گفتار)

آخر میں فاضل مصنف لکھتے ہیں ''ڈونالڈ ٹرمپ نے خودسری کے نشہ میں یہ کہا تھا کہ وہ ایران میں رجیم چینج کرنا چاہتے ہیں لیکن دنیائے اسلام میں جو اہل علم ہیں، ... ان کے نزدیک عرب کی حکومتیں بھی قابل قبول نہیں ہیں... یہ غلط ہے کہ دنیا کے مسلمان ان غیر شیعی سُنّی عرب حکومتوں کو اور حرمین کے متولی کو اپنا پیشوا اور مقتدی سمجھتے ہیں۔''

❑❑❑

عبدالعزیز خالد کی منظوم تمثیل نگاری

مصنف وناشر: ڈاکٹر محمد نورالہدیٰ

صفحات: 228، قیمت: -/350، اشاعت: 2025

ISBN 978-93-90579-79-2

زیر اہتمام: ایلائڈ بکس، دریا گنج، نئی دہلی-110002

Tel. 011-44753890 Mobile: 9953630788

از: ایم نصراللہ نصر ☆

مذکورہ کتاب مدرس ومعلم ڈاکٹر نورالہدیٰ کا تحقیقی مقالہ ہے۔ ان کے حوصلے کی داد لازمی ہے۔ دراصل بات یہ کہ اکثر محقق اپنی تحقیق اور پی ایچ۔ ڈی کی تھیسس کو منظر عام پر لانے کی ہمت نہیں جٹا پاتے۔ وجہ ان کی کمزوریوں اور چوریوں کے پکڑے جانے کا خدشہ لاحق ہوتا ہے لیکن موصوف نے ہمت دکھائی ہے اس لیے ان کو بہت بہت مبارک باد۔

ڈاکٹر محمد نورالہدیٰ کا تعلق گوپال گنج (بہار) سے ہے۔ پیدائش 4 نومبر 1977 کی ہے۔ تعلیم پی ایچ ڈی تک حاصل کی ہے اور مشغلہ درس وتدریس ہے۔ آبائی وطن دربھنگہ ہے۔ ادب سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ ادب کی دنیا میں شناسا چہرے کی فہرست میں شامل ہیں۔ معیار ومنہاج ٹھیک ٹھاک ہے۔ اس کتاب میں موصوف نے جو ابواب قائم کیے ہیں ان کی فہرست کچھ یوں ہے:

۱۔ اردو میں منظوم تمثیل نگاری کی روایت
۲۔ عبدالعزیز خالد کی منظوم تمثیل نگاری
۳۔ 'برگِ خزاں' کی تمثیلوں کا مطالعہ
۴۔ عبدالعزیز خالد کی منظوم تمثیلوں کی انفرادیت

پہلے باب میں انہوں نے بتایا ہے کہ تمثیل عربی لفظ ہے جس کے معنی مثال ،نظیر ،تشبیہ ہے۔ کسی واقعہ کا مثالی انداز بیان بھی تمثیل کہلاتا ہے۔ منطق ،ڈراما اور ناٹک بھی تمثیل نگاری کی مثالیں ہیں۔ نیز اس کی متعدد اور اس کے اقسام کا بھی ذکر کیا ہے اور سلیقے سے سمجھانے کی کوشش کی ہے جو لائق ستائش ہے۔ یہ باب 32 صفحات پر مشتمل ہے جس میں انگریزی ادب سے اس کی تعریف وتوصیف کی مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ اس کی روایت کو بھی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ ان کی تحقیق کے مطابق تمثیل میں دو بنیادی شرائط اور سطحیں کام کرتی ہیں ۔استعارے اور ارتباط ۔ایک جامع اور کامل تمثیل کے لیے یہ لازم ہے کہ مثال اور متن میں ربط کا پہلو مضبوط ہو۔ استعاروں کا مرکزی خیال سے مربوط ہونا بھی لازمی ہے۔ اردو میں منظوم تمثیل نگاری کا معتبر نمونہ اقبال کی شاعری میں موجود ہے ۔ جیسے مسجد قرطبہ،شکوہ جواب شکوہ اور انسان کی نااہلی وغیرہ۔ ان کے علاوہ ابلیس کی مجلس شوریٰ ،عالمِ برزخ ،تصویر و مصور، اور خضر راہ بھی منظوم تمثیل نگاری کی عمدہ مثالیں ہیں ۔ جدید شعرا میں احمد ندیم قاسمی کی نظم 'عنفوان شباب' ملاحظہ فرمائیں:

شبنمِ آئینہ بدست آئی سر برگ گلاب/ ایک معصوم کلی/ شاخساروں سے ہمک کر نکلی/ آئینہ دیکھ کے شرمائی ،لجائی ، کانپی/ جھرجھری لے کے سنبھلنا چاہا/ لیکن احساسِ جمال/ ایک کوندا ہے جو لپکے تو لپکتا ہی چلا جاتا ہے/ اور معصوم کلی/ کپکپاہٹ کے تسلسل سے چٹکنے پہ جو مجبور ہوئی/ چور ہوئی/ غنچہ تخلیق ہوا/ آئینہ چونک اٹھا!

دوسرے اور تیسرے ابواب میں مقالہ نگار نے عبدالعزیز خالد کی ابتدائی زندگی، تعلیم وتربیت اور پیشہ وملازمت کا ذکر کیا ہے پھر ان کی شاعری کا محاسبہ کرتے ہوئے ان کی منظوم تمثیل نگاری کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ موصوف کے مطابق خالد صاحب کی پیدایش 16 جنوری 1927 کو جالندھر میں ہوئی تھی ۔

ابتدائی تعلیم وہیں سے حاصل کی۔ لاہور کے اسکول اور کالج سے ڈگریاں لیں۔ اسلامیہ یونیورسٹی سے معاشیات میں اول نمبر سے کامیابی حاصل کی اور کراچی میں انکم ٹیکس افسر کے عہدے پر فائز ہو گئے۔ بے شمار اکابر ادب نے ان کی علمی، ادبی اور شعری صلاحیت کا اعتراف کیا ہے۔

چوتھے باب میں ان کے مجموعہ کلام 'برگ خزاں' میں موجود منظوم تمثیلوں کا خوبصورت جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اور پانچویں باب میں ان کی تمثیلوں کی انفرادیت کو عکس ریز کیا گیا ہے۔ یہ بھی ثابت کیا گیا ہے کہ ان کے یہاں منظوم تمثیل نگاری کی عمدہ مثالیں موجود ہیں۔ اچھی بات یہی ہے کہ ڈاکٹر محمد نورالہدیٰ نے ان کی منظوم تمثیل نگاری کی تحقیق کی ہے وہ قابل ستائش اور تجسس سے بھرپور ہے۔ ایک تو یہ کہ دربھنگہ (ہندوستان) کا محقق اور تحقیق کسی پاکستانی شاعر کی ادبی خدمات کی۔ لیکن معاملہ جو بھی ہو انہوں نے کام اچھا کیا ہے جس کی پذیرائی ہونی چاہئے۔

☆ مبصر کا پتہ: شالیمار اپارٹمنٹ، 3/A ستین بوس روڈ، بلاک C، بکولتا، ہاوڑہ-711109 (مغربی بنگال) Mob: 9339976034

□□□

یادگار مجلّہ، عالمی یوم یونانی میڈیسن 2026
خصوصی گوشہ
ڈاکٹر محمد فضل الرحمٰن شرر مصباحی

صفحات: 120+80، اشاعت: 12 فروری 2026
ناشر: آل انڈیا یونانی طبّی کانگریس، D-49 نیو سیلم پور، دہلی-53
Tel. 011-47524630 Mobile: 9810429359

—— از: معصوم مرادآبادی☆

آل انڈیا یونانی طبی کانگریس، طب یونانی کے فروغ کے لیے قائم کی گئی ایک سرگرم اور نیک نام تنظیم ہے، جس سے ملک کے تمام سرکردہ اطبا وابستہ ہیں۔ یہ تنظیم ہر سال 12 فروری کو 'عالمی یوم یونانی میڈیسن' بڑے تزک و احتشام سے مناتی ہے اور یہ اجلاس ملک کے مختلف صوبوں میں ہوتے ہیں۔ اس موقع پر ہر برس طب یونانی کی کسی اہم شخصیت پر ایک یادگار مجلہ بھی شائع کیا جاتا ہے۔ حسب سابق اس برس بھی آل انڈیا یونانی طبی کانگریس کی طرف سے لکھنؤ میں عالمی یوم یونانی میڈیسن کا اہتمام کیا گیا اور اس موقع پر بھی ایک شاندار یادگار مجلہ شائع کیا گیا۔ اس بار اس مجلہ کو طب یونانی کی اہم شخصیت ڈاکٹر فضل الرحمن شرر مصباحی سے موسوم کیا گیا اور اس کی صورت گری حکیم وسیم احمد اعظمی نے بڑے سلیقے سے کی ہے۔

حکیم محمد فضل الرحمن شرر مصباحی کی ولادت 15 جون 1944 کو اتر پردیش کے مردم خیز خطہ مبارک پور (اعظم گڑھ) میں ہوئی۔ انہوں نے مبارک پور کے دارالعلوم اہل سنت مدرسہ اشرفیہ مصباح العلوم سے فاضل دینیات کی سند حاصل کرنے کے بعد عربی فارسی امتحانات الہ آباد بورڈ سے مولوی اور عالم کی سندیں حاصل کیں۔ بعد ازاں اعلیٰ تعلیم کے لیے لکھنؤ یونیورسٹی کا رخ کیا اور وہاں سے فاضل ادب کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد اتر پردیش کے بورڈ آف انڈین میڈیسن، لکھنؤ سے ایف ایم بی ایس کی ڈگری حاصل کی اور پھر درس و تدریس کے شعبے سے وابستہ ہو گئے۔ آغاز معین المدارس مبارک پور سے کیا اور بعد کو تکمیل الطب کالج، لکھنؤ میں 1972 سے 1979 تک ڈیمانسٹریٹر رہے اور پھر دہلی یونیورسٹی کے اے اینڈ یو طبیہ کالج سے 1979 سے 2004 تک بطور لیکچرر اور ایسوسی ایٹ پروفیسر وابستہ رہنے کے بعد 2004 میں سبکدوش ہوئے۔ انہوں نے کئی اہم ذمہ داریاں سنبھالیں جن میں تکمیل الطب کالج لکھنؤ کے ریزیڈنٹ میڈیکل آفیسر، اسسٹنٹ پراکٹر، طبیب وغیرہ کی ذمہ داریاں شامل ہیں۔ وہ بطور طبیب نئی دہلی کے آر ایم ایل ہسپتال اور دین دیال اپادھیائے ہسپتال کے یونانی اسپیشلٹی سینٹر کے کنسلٹنٹ طبیب بھی رہے۔ وہ ایک درجن سے زائد طبی اور غیر طبی کتابوں کے مصنف، مولف، مترجم، ہونے کے علاوہ قادرالکلام شاعر اور آل انڈیا یونانی طبی کانگریس کے بانیوں میں سے تھے۔ ان کی اہم تصنیفات میں نمود سحر، ظہور قدسی، محاسبے اور نقد و نظر قابل ذکر ہیں۔ انہیں سروس ڈاکٹر ایوارڈ برائے یونانی سے وزیر اعلیٰ دہلی کے ہاتھوں سرفراز کیا گیا۔ 30 اپریل 2022 کو نئی دہلی میں وفات پائی اور اگلے روز یکم مئی 2022 کو اپنے وطن مبارک پور میں تدفین عمل میں آئی۔

یہ تھا ڈاکٹر محمد فضل الرحمن شرر مصباحی کی زندگی کا مختصر تعارف، جس کا احاطہ اس مجلہ میں بخوبی کیا گیا ہے۔ مجلس ادارت میں ڈاکٹر خورشید احمد شفقت اعظمی، ڈاکٹر مشتاق احمد، ڈاکٹر سید احمد، حکیم وسیم احمد اعظمی، ڈاکٹر محمد عرفان نجف علیمی اور محمد عارف اقبال شامل ہیں۔ حرف آغاز میں مرتب حکیم وسیم احمد اعظمی نے جنہیں دوران تعلیم لکھنؤ کے تکمیل الطب کالج میں ان سے شرف تلمذ حاصل رہا، لکھتے ہیں: ''وہ ہم سے بے انتہا شفقت کا معاملہ فرماتے تھے اور یہ رشتہ ان کے تارنفس ٹوٹنے تک قائم رہا۔ وہ اصاغر نواز تھے اور ہمہ وقت اپنے خردوں کی ادبی، علمی، ذہنی اور فکری تربیت کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ ...وسیع المطالعہ تھے، طبی ادبیات عالیہ پر ان کی گہری نظر تھی، اردو زبان وادب کے رمز شناس تھے۔ فارسی اور عربی میں ید کمال رکھتے تھے۔ غیر معمولی حافظے کے مالک تھے۔ ...ان کی فکر اور نظریہ میں کوئی الجھاؤ اور تضاد نہیں تھا۔ دنیاوی مصلحتوں سے بہت دور اپنی طبی، علمی اور ادبی دنیا آباد کیے ہوئے تھے۔ وہ کثیر المطالعہ اور فنی وفکری اعتبار سے مستحکم تھے۔''

اس یادگار مجلہ میں حکیم وسیم احمد اعظمی کے فکر انگیز اداریہ کے علاوہ جن شخصیات نے ڈاکٹر شرر مصباحی مرحوم کی خوبیوں اور خداداد صلاحیتوں کا اعتراف کیا ہے، ان میں پروفیسر احتشام الحق قریشی، پروفیسر اشہر قدیر، پروفیسر عبدالناصر فاروقی، حکیم وسیم احمد اعظمی، حکیم مصباح الدین اظہر، ڈاکٹر سید شمیم احمد گوہر مصباحی، ڈاکٹر احمد جمال اور ڈاکٹر سید احمد خاں کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ مجموعی طور پر یہ ایک عمدہ پیش کش ہے اور اسے حاصل کرنے کے لیے آل انڈیا یونانی طبی کانگریس، نئی دہلی سے رابطہ کیا جا سکتا ہے۔

☆مبصر سے رابطہ: Mobile:9810780563 (تاج انکلیو، دہلی)

❑❑❑

محترم قارئین!
مجلّہ پر اپنے تاثرات ہمیں واٹس ایپ نمبر 9953630788 پر بھی ارسال کر سکتے ہیں۔
(ادارہ)

رہنمائے علم الصیدلہ

مصنف: ڈاکٹر سیّد اسد رضا زیدی، ڈاکٹر زہرہ زیدی

صفحات: 206، قیمت: -/220، اشاعت: 2021
ISBN 978-81-938928-7-9
ناشر: اسٹار اکیڈمک پبلشرس، A-30 اوکھلا وِہار، جامعہ نگر، نئی دہلی-110025 موبائل: 8700326374

——— از: ڈاکٹر انیس احمد فلاحی☆

صیدلہ علم الادویہ کا اہم اور لازمی جزء عمل ہے۔ اس میں ادویاتی تاثیر والی اشیا کو مختلف مراحل سے گزار کر استعمال کے قابل بنایا جاتا ہے۔ اس موضوع پر طب یونانی کی تاریخ میں بے شمار کتابیں تصنیف کی گئی ہیں۔ صیدلہ طب کا ایک ایسا شعبہ ہے جو روز بروز ارتقا پذیر ہے۔ اس بات کی ضرورت ہمیشہ باقی رہے گی کہ اس علم وفن سے وابستہ افراد جامع طریقہ سے اس فن کو محقق کریں اور اس پر اظہار خیال بھی کریں۔

زیر نظر کتاب یونانی ذخیرۂ طب میں اس اعتبار سے ایک اضافہ ہے کہ اس میں تقسیم ادویہ کے معیاری طریقوں کو جدید نقطۂ نظر سے بیان کیا گیا ہے اور دواؤں کی فروخت وتقسیم سے متعلق قانونی پہلوؤں پر بھی گفتگو کی گئی ہے۔

کتاب کی زبان سہل اور پُرکشش ہے لیکن بعض جگہ املا، کتابت اور پروف ریڈنگ کی غلطیاں موجود ہیں جن کی اگلے ایڈیشن میں اصلاح ہونی چاہیے۔ زیر مطالعہ کتاب میں 'صیدلہ' کا انتساب صندل کی طرف محل نظر ہے۔ صیدلہ یونانی لفظ Pharmacon سے معرّب ومستعار اور 'صیدل' کا مصدر ہے۔

بحیثیت مجموعی یہ کتاب طب یونانی اور یونانی فارمیسی کے طلبا کے لیے کافی مفید ہے۔ اس کو مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اور مکتبہ الشفاء نئی دہلی سے بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔

☆مبصر سے رابطہ: ابوالفضل انکلیو ا، جامعہ نگر، نئی دہلی-110025
Mobile: 9810385610

❑❑❑

نشانِ راہ، نئی دہلی (کتابی سلسلہ ۵)

مدیر: ارشد سراج مکّی

شمارہ: اپریل تا جون 2026، صفحات: 80، جلد: 2، شمارہ: 2
قیمت: -/50 روپے فی شمارہ
پتہ: ایڈیٹر مجلّہ نشانِ راہ، K-6 بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی -25
Email: majallahnishanerah@gmail.com
Mobile: 9899545546

———از: محمد عارف اقبال

اردو میں مذہبی مجلات و رسائل کی اشاعت کی تعداد رفتہ رفتہ کم ہو رہی ہے۔ سوشل میڈیا نے خاص طور سے متاثر کیا ہے۔ ایسی صورت میں مجلّہ 'نشانِ راہ' کا اجرا ہمت اور حوصلے کی بات ہے۔ مجلّہ کے ایڈیٹر ارشد سراج مکّی کی دیرینہ خواہش اور انتھک کاوش کے نتیجے میں اس مجلّہ کی اشاعت 2025 میں شروع ہوئی۔ اس مجلّہ سے منسلک اکثر افراد اُتر پردیش کے غازی پور سے تعلق رکھتے ہیں۔ انتظامی اور دفتری امور کا پتہ اگرچہ دلّی کا ہے لیکن مجلّہ میں درج پتہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ضلع غازی پور میں واقع دارالقضاء (آل انڈیا مسلم پرسنل لابورڈ) آفس ہی اس کی منزل ہے۔ غازی پور ہی میں اسلامک سنٹر (تعلیمی و تربیتی مرکز) ہے جس کے روح رواں ارشد سراج مکّی ہیں۔

'نشانِ راہ' کا یہ پانچواں شمارہ (کتابی سلسلہ) متنوع موضوعات کے مضامین پر مشتمل ہے۔ اس میں قرآن و حدیث اور دیگر دینی موضوعات کے علاوہ گوشہ خواتین، اصلاح معاشرہ، فکر صحت، شعر و نغمہ، گوشہ اطفال، بحث و نظر، قارئین کے تاثرات اور کتابوں کے تعارف و تبصرہ شامل ہیں۔ اس طرح سے یہ رسالہ سماج کے ہر طبقے کے لیے مفید محسوس ہوتا ہے۔

'نشانِ راہ' کے مدیر جو اس رسالہ کے 'ناشر' بھی ہیں، سب سے پہلے ان کی ایک تحریر 'ناشر کا خط' کے عنوان سے شامل ہے۔ یہ انداز مدیر نے غالباً معروف ماہنامہ افکار ملّی، نئی دہلی سے مستعار لیا۔ اس کے ایڈیٹر ڈاکٹر سیّد قاسم رسول الیاس نے اوّل روز سے 'ناشر کا خط' اپنے قارئین کو پڑھوایا ہے۔ اس شمارے کے 'خط' میں مجلّہ کے مقصد پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

''... اس میں قرآن فہمی، احکام و مسائل، دعوت و تربیت، خواتین و خاندان، معاشرتی اصلاح اور حالاتِ حاضرہ جیسے اہم موضوعات کو اس کے توازن کے ساتھ شامل کیا گیا ہے۔ ... خصوصاً ایسے دور میں جب اُمت مسلمہ فکری انتشار، تہذیبی دباؤ، اخلاقی کمزوری، خاندانی بحران اور عالمی سطح پر سنگین آزمائشوں سے دوچار ہے، ایک سنجیدہ دینی و فکری مجلّہ کی ذمہ داری صرف معلومات فراہم کرنا نہیں، بلکہ شعور کو بیدار کرنا، فکر کو منظم کرنا اور دین کو اس کی جامع روح کے ساتھ پیش کرنا بھی ہے۔'' ناشر نے اپنے خط میں جو دعوے کیے یقینی طور پر قابل ستائش ہیں لیکن عملی طور پر اس رسالہ کے ذریعہ وہ کس حد تک کامیاب ہوتے ہیں، اس وقت کا انتظار ہے۔

'ناشر کا خط' کے بعد ارشد سراج مکّی نے اپنا اداریہ 'حرفِ آغاز' کے نام سے لکھا ہے۔ موضوع ہے 'امریکہ اور اسرائیل کا ایران پر حملہ'۔ حرفِ آغاز خوش آیند ہے لیکن اس تحریر کا آخری پیرا ذرا مبہم ہے۔ مشرق وسطیٰ، عرب ملک اور ایران کے حوالے سے لکھی گئی باتیں واضح نہیں ہیں۔

بہرحال اس مجلّہ کے مدیر اور مجلس ادارت و مجلس مشاورت کے ارکان مبارکباد قبول کریں کہ مسلمانوں کو ذہنی، فکری اور شعوری طور پر بیدار کرنے کے لیے انہوں نے گھٹتے ہوئے قارئین کے دور میں رسالہ کی اشاعت کی ہمت جٹائی ہے۔

□□□

پروفیسر عبدالبرکات کی دو تصانیف

تصوّرات و تفہیمات

صفحات: 400 قیمت: -/445 اشاعت: 2025
ISBN 978-93-90579-77-8

مثنوی قطب مشتری کا تنقیدی مطالعہ

صفحات: 152 (مجلد)، قیمت: -/300
ISBN 978-93-90579-29-7

رابطہ: اردو بک ریویو، دریا گنج، نئی دہلی
Tel. 011-44753890 / 9953630788

اعلان داخلہ/ برائے تعلیمی سال ۲۰۲۶-۲۷ء (داخلہ یتیم اور غیر یتیم طلباء)

دینی وعصری علوم کی اپنے طرز کی مشہور اقامتی (Residential) تعلیم گاہ

یتیم خانہ اسلامیہ گیا

THE GAYA MUSLIM ORPHANAGE

109 سالہ خدمات

ہماری نمایاں خصوصیات ● کم خرچ میں بہتر تعلیم وتربیت، برتر نمبر اور روشن مستقبل کیلئے جلد سے جلد اپنے بچوں اور بچیوں کا داخلہ کرائیں اور دنیا وآخرت بنائیں۔

تعلیم ● پانچ زبانوں میں قرآن اور اسلامیات کے ساتھ میٹرک تک معیاری تعلیم، انگریزی، اردو، ہندی عربی، فارسی مع بہار بورڈ سلیبس (B.S.E.B) ● درجہ اوّل (I) تا درجہ دہم (X) میٹرک تک کی تعلیم مع کمپیوٹر کی تعلیم (بہار اسکول اکزامنیشن بورڈ سے منظور شدہ) ● عنایت (I.T.I) میں دوسالہ ڈپلوما کورس کی تعلیم ● ڈپلوما کی ڈگری اب I.Sc. کے برابر ● شعبہ حفظ وغیرہ۔ **داخلہ** درجہ اوّل تا درجہ درجہ نہم (IX) ● حفظ کے ساتھ ساتھ میٹرک (X) تک اسلامی ماحول میں دینی وعصری تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت کا بھی نظم ● ادارہ کے ہی احاطہ (Campus) میں دو ہرے بھرے پارک کے ساتھ شاندار مسجد، تعلیم گاہ، اقامت گاہ اور دوسرے شعبہ جات وغیرہ۔ اس لئے بچوں کو کہیں آنا جانا نہیں پڑتا ہے۔ ● طلباء کی ذہنی وجسمانی نشوونما کے لئے کھیل کود کا نظم اور ہر جمعرات کو ثقافتی پروگرام۔ ● ہوادار اور کشادہ کلاس روم اور بہترین دو منزلہ عمارت مع بورڈنگ (روشنی، پنکھا اور بجلی) وغیرہ۔ ● صحت وصفائی پر خصوصی توجہ، طبی سہولیات ● یتیم طلباء وغیر یتیم طلباء کا رہنا سہنا اور کھانا پینا ایک ساتھ ● باہری طلباء بھی ادارہ میں اپنے خرچ پر بورڈنگ (ہوسٹل) میں رہ کر تعلیم حاصل کیا کرتے ہیں۔ ● بچوں کے لئے لائبریری اور کمپیوٹر کی تعلیم ● ادارے سے ملحق کھیل کا اپنا بڑا وسیع میدان ● معقول ومناسب تعلیمی وخوراکی فیس ● عنایت (I.T.I) میں ۲ دو ٹریڈ کی تعلیم (۱) الیکٹریشن (ELECTRICIAN) (۲) فیٹر (FITTER) NCVT بھارت سرکار نئی دہلی سے منظور شدہ۔ ● میٹرک پاس طلباء کے لئے عنایت (I.T.I) کا یتیم خانہ سے ملحق یتیم خانہ کے ہی احاطہ (Campus) میں شاندار دو ۲ منزلہ عمارت مع ورکشاپ (Workshop) ● سرکاری اسکیم کے تحت یہاں سے میٹرک فرسٹ ڈویژن سے پاس کرنے والے طلباء کو دس ہزار (Rs. 10,000) روپے کا انعام۔ **تعلیمی مراحل** مرحلہ ابتدائی: مدت تعلیم: پانچ سال۔ اول تا پنجم (درجہ اطفال سمیت چھ سال) مرحلہ ثانوی: مدت تعلیم: تین سال۔ درجہ ششم (VI) تا درجہ ہشتم (VIII) مرحلہ اعلیٰ مدت تعلیم: دوسال، درجہ نہم (IX) ودہم (X) ● شعبہ حفظ مدت تعلیم: چار سال۔

نوٹ یہاں کے طلباء (ENAYETH. I.T.I) سے دوسالہ کورس کر کے ملک کے ا۱' راو& ہرا چھی نوکری کر رہے ہیں۔ اور یتیم خانہ سے میٹرک (MATRIC) کرنے کے بعد ڈاکٹر، انجنیر، ہیڈ ماسٹر، اسکول کے استاد،)وفیسر اور وکیل وغیرہ بن کر ملک کی *مت ا –م دے رہے ہیں ● یتیم خانہ کا ا (یتیم طا ۔ ا علم علی + ھ مسلم یونیور ∅ میں)وفیسر $ کے بعد (AMU) کا قائم مقام وائس چانسلر (V.C.) بھی رہ چکا ہے۔

اخراجات بوقت داخلہ مجموعی اخراجات بورڈنگ کے طلباء 6220 روپئے۔ بیرونی طلباء: تقریباً 650 تا 3500 روپئے۔ مع رجسٹریشن (FEE) فیس درجہ کے حساب سے رقم گھٹتی بڑھتی ہے۔

یادرکھیں ❶ یتیم خانہ کے یتیم طلبا سے عنایت (I.T.I) میں کسی طرح کا کوئی خرچ نہیں لیا جاتا ہے۔ تعلیم وطعام ورہائش وغیرہ بالکل مفت (Free)۔ ❷ بورڈنگ (ہوسٹل) کے بیرونی طلبا کے طعام فیس کا تعین ماہانہ خرچ کے حساب سے ہوا کرتا ہے۔ ● ماہانہ فیس تقریباً اٹھارہ سو روپئے (Rs. 1800/=) ہوتی ہے۔ ❸ ہر نئے تعلیمی سال میں تجدید داخلہ ضروری ہے۔ ❹ سرپرست اور طلبا پر ادارہ کے قواعد وضوابط کے داخلہ فارم پر لکھے گئے قواعد کے مطابق پابندی لازمی ہے۔ ❺ ماہانہ تعلیمی عطیہ ودارالاقامہ فیس بارہ ۱۲ ماہ کی اور طعام فیس دس ۱۰ ماہ کی لی جاتی ہے۔ ❻ بوقت داخلہ آدھار کارڈ کی فوٹو کاپی/ تاریخ پیدائش کا تصدیق نامہ اور اصل (Original) ٹی۔سی (T.C) جمع کرنا لازمی ہے۔

نوٹ ادارہ کی مختصر تاریخ دستاویزی (Documentary Film) فلم نذر عنایت You -Tube (Nazr-e-Enayeth) پر دیکھیں۔

چیک وڈرافٹ اورکوربینکنگ سلپ پر صرف یہ لکھیں۔ THE GAYA MUSLIM ORPHANAGAE

برائے رابطہ چیک ڈرافٹ اور منی آرڈر بھیجنے کا پتہ Hon. Secretary,THE GAYA MUSLIM ORPHANAGE ●

Cherki-824237, Distt: Gaya (Bihar) India : **9801213022, Whatsapp No. 7258063440**

Beneficiary Name: THE GAYA MUSLIM ORPHANAGE
Bank A/C No.: 300402010002982
Bank IFSC Code No: UBIN0530042
Bank : UNION BANK OF INDIA (MAIN BRANCH GAYA)

Scan & Pay

یادرکھیں بینک میں رقم ٹرانسفر کی تفصیل۔ برائے مہربانی اسکین اینڈ پے (Scan & Pay) یا کسی ذریعہ سے رقم ٹرانسفر کے بعد اسکرین شاٹ (Screen Shot) مع نام وپتہ اوپر کے وہاٹس ایپ نمبر پر وہاٹس ایپ کردیں تاکہ رسید بھیجی جاسکے۔

E-mail: gmocde@yahoo.com.in
Website: www.gmogaya.in

ڈاکٹر زیڈ۔ ایچ۔ خان
اعزازی سکریٹری

انجینئر محمد حسنین خان::
9631867066
صدر

گل کنج (کلیات شاہ)

شاعر: شاہ حسین نہری
تدوین: ڈاکٹر سیدہ فرہ فاطمہ نہری، ڈاکٹر محمد صفی انوری
صفحات: 448، قیمت: -/500، اشاعت: 2025
ISBN 978-93-90579-83-9
ناشر: ہمدرد پبلک لائبریری، انوری ہاؤس، عزیز پورہ،
بیڑ-431122 (مہاراشٹر) موبائل: 9422931765

——— از: سعید اختر اعظمی☆

ادب مسائل حیات کا حل نہیں، بلکہ سوالات قائم کرتے ہوئے ادبی قدروں کی معیار بندی ہے۔ پھر بھی یہ حیات انسانی سے قریب تر ہے۔ سوال یہ ہے کہ تخلیق ادب کا موجب کیا ہے؟ اس کا جواب پروفیسر نکلسن نے علامہ اقبال کی 'اسرار خودی' کا انگریزی ترجمہ کرنے کے بعد دیا تھا۔'یہ کتاب بنیادی طور پر دو چیزوں کی طرف بلاتی ہے۔ اول قرآن، دوم محمد ﷺ'۔ شاہ حسین نہری کی شاعری کا بنیادی محرک وارتکاز یہی ہے۔ وہ خودگر، خوددار، خودنگر اور خودداری کے تحفظ کے حوالے سے 'خودسر' بھی رہے ہیں۔ اخلاقی وجود کی تطہیر اُن کا محورِ فکر ہے جو 'ادب عالیہ' کی سرشت میں شامل ہے۔ اس تخلیقی موقف کو ادبی جمالیات کے منافی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ یہ فکری رویہ ایسا بیانیہ ہے جس میں نوحہ ونقیب کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ وہ کسی تحریک یا نظریہ سے وابستہ نہیں بلکہ خدا اور کائنات کے درمیان رشتوں کے استحکام اور تقدیس کے متلاشی ہیں۔ انہوں نے جدید فلسفیانہ نظریات سے اظہار لاتعلقی، روایت کی تنسیخ، لسانی انتشار، لغویت کے کہرام اور داخلیت کے قہر سے اعراض کیا ہے۔ اسی لیے ان کے اشعار جدید حسیت کا عکس بن گئے ہیں۔

شاہ حسین نہری (حقیقی نام: سید شاہ حسین شہید نہری۔ ولادت: 12 فروری 1941، وفات: 23 اپریل 2026) نے عمر کی دو دہائی پار کرتے ہی میدان شاعری میں قدم رکھ دیا۔ یہ وہ وقت تھا جب ترقی پسند تحریک اور جدیدیت کا دَور دَورہ تھا اور شعرا ونثر نگار تجریدیت و مہملیت کے انبار لگا رہے تھے۔ شاہ نے اس متشدد رویے کی لہر میں بہہ جانے کے بجائے شفاف افکار و اظہار کو وسیلہ بنایا اور علائم و استعارات، تناسبات و تضادات سے متحرک امیجری کی تشکیل کی۔ انہوں نے احتجاج و بغاوت سے انحراف کرتے ہوئے امیدو رجائیت کو امتیازی وصف بنایا۔ یوں کلاسیکیت سے جدیدیت تک کے تمام حوالے ان کے شعری ورثہ کی انفرادیت بن گئے۔ اصناف سخن میں انہوں نے غزلیات، منظومات، رباعیات، شخصی مراثی، بچوں کے لیے نظمیں اور قطعہ تاریخ اس طرح لکھے کہ کسی پہلو سے انگلی اُٹھانے کی گنجائش ہی نہ رہی۔ ہر صنف اتنی مکمل کہ ماہرین سخن 'بے داغ' کہنے پہ مجبور ہوگئے۔ ان کے 9 مجموعے (سامان تسکین، شب آہنگ، شب تاب، رباعیات شاہ، ربیعہ، شاہ بانی، شب آفتاب، گل بدن کی یادیں، میرے گلشن کے پھول) منظر عام پر آئے جن میں چار صنف رباعی کا احاطہ کرتے ہیں۔ یہ دو دواوین رباعی ہیں جن میں سے ایک ان کی شریک حیات 'عارفہ گل بدن' کی رفاقت، محبت، قربت اور ابدی رخصت کا یادخزینہ ہے۔ یہ رباعیات دیکھیے:

وہ شاہ کھنک دار، سریلی آواز
چاندی کی گھنٹیوں سی بجتی آواز
دل کی بستی میں اب بھی گونجتی ہے
رس گھولتی، پیاری، جل ترنگی آواز

....

ہاتھ اپنا چھڑا کر ہی رہی دنیا سے
کیا تو سچ مچ چلی گئی دنیا سے
کیوں شاہ کو گل بدن اکیلا چھوڑا
کیوں میرے بنا چل بھی بسی دنیا سے

....

اشکوں کے وسیلے سے دکھ بولیں نین
اس طرح سے آتا ہے دل کو کچھ چین
تصویر اس گل بدن کی بنتی مٹتی
اشکوں میں لیے بیٹھے ہیں یہ شاہ حسین

....

احباب یہ کہتے ہیں کہ آباد رہوں
جب تک ہے زندگی جیوں، شاد رہوں
کہتی ہے مگر مری حیات باقی
ہوں دستِ دعا، شاغل فریاد رہوں

خارزار دشت رباعی کی سیر کرنے والے محمد علی اثرؔ اور علامہ ناوکؔ حمزہ پوری کی قدرشناسی نے شاہ کی رباعی گوئی کے فن کو مہمیز کیا اور وہ اس کے چوبیس اوزان کو بہ حسن وخوبی برتنے میں کامیاب رہے۔ وہ خود اس صنف سخن کے بارے میں کہتے ہیں:

ہے صنف رباعی صنف خوش گفتار
اس کی گفتار چوکھی پہلودار
ربط اور ترقی، آخر مصرع، وزن
ہوں چاروں خوب تومعنی کی بہار

....

کہتی ہے رباعی کہ تری ہوں پیاری
سچ ہے یہ، نہیں شاہ! نری لفاظی
یہ پیار ہمیشہ رہے باقی تیرا
کہتی ہے قلم سے مرے ہرباریہی

....

اخرب اخرم ہی کی کہانی کب ہے
یہ محض سبب وتدنشانی کب ہے
کچھ اور بھی ہے اصل رباعی کی شناخت
یہ صنف لطیف لن ترانی کب ہے

مماثل ومغائر اور کشف ووجدان کا یہ سفر شاعر کی تنوع رنگی اور فکری وسعت کا بیانیہ ہے۔ بقول خود:

ہے شاہ ترا خوب یہ شعری جھرنا
بیدار دماغی کا سماوی سوتا
ہے شاعری تیری کہ مقال شیریں
تسکین ومسرت کا زلالی چشمہ

'سامان تسکین' حمد ونعت ومنقبت سے آراستہ ہے۔ لطف یہ ہے کہ دوران مطالعہ وجدانی وانجذابی کیفیت رگ وپے میں سرایت کرتی محسوس ہوتی ہے۔ چند کیفیات ملاحظہ ہوں:

رب مرے تو ہے مہرباں، صدشکر
نیکیوں کا ہے قدرداں، صدشکر

....

رتبے میں مصطفیٰ کے نہیں دوسرا شریک
اللہ نے بنایا نہیں آپ کا شریک
اللہ لاشریک ہے معبود آپ ﷺ کا
بندے خدا کے آپ ہیں، بندوں میں لاشریک

....

شیرازہ جذبات کی تالیف کروں گا
اللہ کے محبوب کی توصیف کروں گا
ڈھلتی ہے زباں کوثر وتسنیم سے میری
اب ساقی کوثر کی میں تعریف کروں گا
قرآن بھی، سنّت بھی ہے محفوظ جہاں میں
ناداں ہے جو کہتا ہے کہ تحریف کروں گا

....

ہیں احمد محمد، بشر ہیں، نبی ہیں
ہے اللہ اللہ، وہ تو احد ہے
ہدایت ہے امی لقب کی ہدایت
سند آپ سے جو ملے مستند ہے

ایسے میں 'عید میلاد' کے جشن پرروشنی کا اہتمام چہ معنی دارد، جبکہ مسجدیں مرثیہ خواں ہیں، اسوہ مصطفیٰ ہوتے ہوئے دریوزہ گری کو شیوہ بنائے ہوئے ہیں، بندگان خدا ظلمت وجہل کے لقمہ تر ہیں، خود کو حقیر اور دوسروں کو کثیر سمجھتے ہیں، غیروں سے مراعات وخیرات کے طالب ہیں، مومن ومسلم ہوتے ہوئے دلوں میں اصنام گھروں کی تعمیر کرلی ہے، ہم برائے نام امتی ہیں تبھی دربدری نصیبہ بن گئی ہے۔

'شب آہنگ'، 'شب تاب' اور 'شب آفتاب' من وتو کے رازونیاز سے عبارت ہے جس میں محبوب حقیقی کے شانہ بہ شانہ محبوب مجازی بھی ہے۔

میں دھواں ہوں ہوا کے ہاتھوں میں
میں سحاب، آب کا خزینہ تو

....

بے خیالی کا کچھ سبب سوچیں
ذہن کو اس خیال پر لے جائیں

....

آنکھوں سے تیری یاد کی شبنم ٹپک پڑی
لَو دے اُٹھا گلاب ترے انتظار کا

....

زرخیز یاں ہیں میرے تخیل کی بے کراں
یوں بے سبب ہی دل میں نہ آیا کرے کوئی

....

لہجے کاحسن، بات کی نرمی، سپردگی
خود کو بُھلا بھی دوں میں، بہانہ کوئی تو ہو

....

اُس تک آواز پہنچتی ہومری تو کہہ دوں
کوئی مجھ سا ہے جہاں میں، نہ تمہارے جیسا

....

کون دل پر یہ آدھمکتا ہے
کھڑکھڑاتے ہیں کیوں کواڑ میاں

تعلّی کی رنگ آمیزی قرطاس کے کینوس پہ اتنی خوب صورت ہے کہ قوس قزح کے رنگ بھی پھیکے پڑ جائیں۔ یہ دیکھیے:

میں شاہ بھی ،حسین بھی ،نہری بھی ، کیا کہوں
میرا ہر ایک رنگ میں سایہ زمین پر

....

مری پہچان میرا نام ہی ہے بس
کہ ہاں ہم نام نہری شاہ کا ہوں

....

لطف ملتا ہے کچھ الگ اس میں
خاص ہے شعر شاہ جی والا

....

بے خدا، شاہ بھی کہاں کب ہے
ہے یہ شہرہ کہ باخدا ہو تم

....

کس رنگ میں یہ شاہ غزل تیری ہوئی ہے
اس رنگ ابھرتا ہوا ہے تجھ میں ،سنا، کون؟

....

شاہ اپنا بھی خوب شاعر ہے
بات کی آپ نے ٹھکانے کی

....

ہے لہلہاتی ہوئی کیا خیال کی کھیتی
کہ آنسوؤں سے اسے شاہ سینچتا ہے

’میرے گلشن کے پھول‘ میں حمد،نعت ،اردو زباں،تعلیم ،پہیلی ، وقت ، برسات، بجلی ، قصہ کہانی منظوم کے علاوہ نواسے نواسیوں کے لیے لکھی گئی پیاری پیاری نظمیں بھی شامل ہیں۔نظم’پانی‘ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

پانی ہے رب کا معجزہ
ہے خاصیت اس کی جدا
ہے معجزہ پانی یہ خاص
سب سے الگ اس کے خواص
پانی سے پائیں زندگی
پانی سے ہیں زندہ سبھی
سب رنگ ،سارے ذائقے
پانی کے پاتے ہیں مزے
پانی اگرجم جائے گا
تو برف یہ کہلائے گا

’مثنوی در ہجو حجرہ خود‘ میں رہائشی کمرے کی ہولناکی کا جو نقشہ انہوں نے کھینچا ہے اسے پڑھ کر روح کانپ جاتی ہے اور اختتامی شعر پہ آمین بے ساختہ لبوں پہ مچل اُٹھتا ہے۔

رحم کر، ہو مرا خیال تجھے
یاں سے اللّٰہ اب نکال مجھے

’رنگ یادرفتگاں‘ قاضی سلیم، رشید حسن خاں، ہارون رشید مدیر انقلاب، سید شوکت علی ،عروج قادری ، محمد اشفاق احمد، سید ابوالحسن علی میاں ندوی، عارف خورشید، شمس الرحمن فاروقی ودیگر سے دیرینہ تعلق کا اظہار اور فنی خراج عقیدت ہے۔ احسن یوسف زئی کے لیے لکھا گیا مرثیہ گویا زبان خود سے قاری کے جذبات غم کی ترسیل ہے جو اُن کی حالیہ اَبدی جدائی پہ عین فطری ہے۔

ساز اسباب راز ہستی ہے
رہن مضراب ساز ہستی ہے

منتشر ہوگا تن کا شیرازہ
ہو بھکاری کوئی کہ شہزادہ
تھا جسد اس کا بھی خمیر خاک
زندگی اس کی ہے غزل زندہ
اس کے جیسا کہاں سے لائیں ہم
اب کہاں ڈھونڈنے کو جائیں ہم

☆مبصر سے رابطہ: ریاض۔ (سعودی عرب)
Mobile: +966598300320

□□□

جمالیات

(کلام جمال صابری)

مرتب: مہر عالم خان
صفحات: 311، قیمت: -/499، اشاعت: 2025
ISBN 978-81-989866-4-1
ناشر: ریختہ پبلی کیشنز، B-37، سیکٹر1، نوئیڈا-201301 (یوپی)
Email: contact@rekhta.org

——— از: سعید اختر اعظمی ☆

جمال صابری (حقیقی نام: عابد رضا خاں، ولادت: 1899، وفات: 1987) کا تعلق علی گڑھ کے متمول اور ادبی خاندان سے تھا۔ شہر کے معروف وکیل حسن رضا خاں کی پانچ اولادوں (صغریٰ بیگم، محسن رضا خاں (علی گڑھ میونسپلٹی انسپکٹر) عابد رضا خاں (شاعر، مدیر ہفتہ وار شباب علی گڑھ) حامد رضا خاں (تبسم نظامی) زاہد رضا خاں (کباب علی گیرین) میں سبھی نے کسی نہ کسی حوالے سے شہرت پائی۔ حسن رضا خاں کا کم عمری میں انتقال ہوگیا جس کے سبب معاشی حالات خراب ہوگئے۔ اجداد کی حویلی پر شہر کے دبنگ کے قبضہ نے رہی سہی کسر بھی پوری کردی۔ ایسے ناگفتہ بہ حالات میں ان کی بیوہ بشیر بیگم نے اپنی پانچوں اولادوں کی پرورش کی ذمہ داری بہ حسن وخوبی نبھائی۔ جمال صابری کی شاعری کا آغاز عنفوان شباب میں ہوا اور انہوں نے علامہ سیماب اکبر آبادی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا جو داغ دہلوی کے شاگرد تھے۔ یہ رہ نمائی فن کو نکھارنے میں خاصی معاون ثابت ہوئی۔ جمال صابری کی شعری وراثت ان کے بھانجے ساغر نظامی (ولادت: 1905، وفات: 1984) تک پہنچی جو 1940 تا 1970 افق شاعری پہ ماہتاب کی صورت جلوہ گر رہے اور پدم بھوشن کے مستحق قرار پائے۔ اپنے ادبی ذوق کو فروغ دینے کے ساتھ برطانوی سامراج کے خلاف جدوجہد آزادی میں علی برادران کی خلافت تحریک میں بھی وہ پیش پیش رہے۔ ان کی پہلی شادی 21 مارچ 1921 کو شاعرہ عابدہ خانم نسرین سے ہوئی جن سے ایک بیٹا شاہد رضا خاں ہے۔ 30 جولائی 1933 کو اہلیہ کی ناگہانی وفات پر وہ غم بھلانے کی خاطر ممبئی چلے گئے جہاں عزیز جمال شیخ (اداکارہ ثریا کے والد) کے گھر قیام رہا۔ جلد ہی انہوں نے فلمی دنیا میں بطور اسکرپٹ رائٹر، مکالمہ نگار اور نغمہ نگار اپنا منفرد مقام بنالیا۔ 1935 میں نمائش کے لیے پیش کی گئی 'تلاش حق' (نرگس کی والدہ اداکارہ جدن بائی کی فلم) ان ہی کی تحریر کردہ تھی جس میں انہوں نے خزانچی کا کردار بھی ادا کیا تھا۔ 1937 میں علی گڑھ واپسی کے بعد انہوں نے خود کو شاعری، ڈرامہ نگاری اور صحافت کے لیے وقف کردیا۔ زوجہ اول کے انتقال کے دس برس بعد یہیں ان کی شادی بھولی بیگم سے ہوئی جن سے دو اولادیں ہیں۔ شاہدہ جمال اور شکیل رضا خاں۔ مشاعروں میں سامعین سے داد وتحسین حاصل کرنے کے ساتھ ہفتہ وار شباب کے اصلاحی مضامین کے ذریعہ وہ قارئین کے روبہ رو ہوئے۔ علی گڑھ کے معروف 'ظہور کا ہوٹل' میں بیٹھ کر چائے اور سگریٹ کے مرغولوں میں وہ اپنے اخباری مضامین لکھا کرتے تھے جس کی ڈرامائی تشکیل بی بی سی لندن کے براڈ کاسٹر پرویز عالم نے کی۔

جمال صابری نے 1963 میں اپنا مجموعہ کلام مرتب کرلیا تھا جو صحافتی مصروفیات کے سبب ان کی حیات میں شائع نہ ہوسکا۔ بی بی سی براڈ کاسٹر پرویز عالم 2022 میں اپنی ہندوستان آمد پر مدیر شباب کے پوتے اور شاہد رضا خاں کے بیٹے ساجد رضا خاں سے ملے تو کلام جمال دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ بیاضوں، کاغذات اور یادداشتوں کے سہارے اس کی یکجائی ہوئی۔ اوزان وبحور کی درستی اور ترتیب وتالیف کے لیے انہوں نے رفیق دیرینہ مہر عالم کی خدمات حاصل کیں اور خواجہ غلام

السیدین سے تاریخ اشاعت پہ ایک قطعہ بھی لکھوایا۔ گویا کہ ارکان ثلاثہ کی مساعی جمیلہ سے کلام جمال صابری 'جمالیات' قدردان سخن تک پہنچنے میں کامیاب ہوا۔ یہ 7 نعتوں، حسین وکربلا، غوث اعظم، غریب نواز، امیرخسرواورصابری دربار کی منقبت، 116 غزلیات، موضوعات دیگر پہ لکھی گئی منظومات اور قطعات پہ مشتمل ہے۔نعت، سلام ومنقبت میں ان کی عقیدت سطر سطر سے جھلکتی ہے۔ یہ اشعار دیکھیے:

ہوتی ہے پانچ وقت اذاں بام نور پر
ہرروح جاگتی ہے محمد کے نام سے

....

جمال بزم شریعت حسین ابن علی
مقام دین کی عظمت حسین ابن علی

....

محبت جن کا مرکز ہے میں قرباں اُن خیالوں پر
جنہیں خسرو سے نسبت ہے میں ان افکار کے صدقے

غزلوں میں روایت کی تقلید کرتے ہوئے رومان، جام ومینا، خاروگل اورعنوان دیگراں پرجذبات واحساسات کی ترجمانی کی گئی ہے۔ یہ اشعار دیکھیے:

عجب وابستگی ہے ان کے عنبر ریز بالوں سے
مجھے آتی ہے خوشبورات بھر اپنے خیالوں سے

....

سفر ذوق سفر سے ہے عبارت
نہ پہنچائیں گے منزل تک سہارے

....

خلش رہتی ہے اب اس کیفیت سے میرے زخموں میں
ہوں لاکھوں زخم تو قربان اندازنمک داں پر

....

ابھی تک گرم ہے خاکسترپروانہ ، دفنادو
کہیں ایسانہ ہومرنے کو پھرتیار ہوجائے

....

مرے مغموم دل پر چاندنی میں کیا گزرتی ہے
کسی دن چاندبن کرآپ اس کا امتحاں کرلیں

عابدرضاخاں نے جمال صابری کے قالب کوکیوں اختیار کیا، اس کرم فرمائی کا حوالہ دوغزلوں کے مختلف اشعار سے ملتا ہے۔ ملاحظہ ہوں:

جمال ان کی زباں پرآج آیانام پھرتیرا
کرم فرمانگاہ صابری معلوم ہوتی ہے

....

اپنا بنالیا مجھے صابرنے اے جمال
دربارصابری میں مری بات رہ گئی

منظومات میں 'جلووں کی فراوانی' غلامان محمد کی طرز جہاں بانی کا بیان ہے تو 'رمضان المبارک' ضیابارفضاؤں والے مہینے کا تذکرہ۔ 'بیداری' میں رفعت انساں ہے تو 'پیغام حیات' میں تنظیم قومیت کانظم۔ 'اجمیرشریف' انہیں مے خانہ وحدت کا ساقی لگتا ہے تو 'تاج محل' حسین رخ کا حجاب اورتصوردل عاشق۔ تاج محل میں مدفون 'ممتازمحل' پہ لکھے گئے یہ اشعار دیکھیے:

زمانہ اپنے مرکز سے اُٹھاانگڑائیاں لے کر
چلاانساں کی جانب عشق پھرتیروکماں لے کر
ستاروں کو سنبھالے خود زمیں پہ آسماں آیا
نیا اک چاندنکلامشعل نورجہاں لے کر
تصورتاج کا قدرت کو اس درجہ پسندآیا
محبت خلد سے آئی دل شاہ جہاں لے کر
یہی دل بن گیادل بر، اسی کوناز کہتے ہیں
یہ رشک ماہ کامل ہے، اسے ممتاز کہتے ہیں

ڈیڑھ درجن سے زائد قطعات میں رومانیت کے سُرساز کے ساتھ حقائق کی تپش بھی ہے۔ یہ قطعہ دیکھیے:

حقیقت میں نہ پتھر ہے، نہ چاندی ہے، نہ سونا ہے
نہ ہنسنا اس کا ہنسنا ہے، نہ رونا اس کا رونا ہے
محبت کھیلتی ہے ،توڑ دیتی ہے اجل آکر
جسے انسان کہتے ہیں وہ مٹّی کا کھلونا ہے

سطور آخر کے طور پر جمال صابری کے یہ اشعار ملاحظہ کیجیے جس میں رومان کی سحرطراز کائنات اپنے حصار میں لینے کے لیے بے قرار لگتی ہے۔

رہ حیات میں اک شام کی ضرورت ہے
سفرطویل ہے ،آرام کی ضرورت ہے
وہ مسکرائیں گے آواز دوگھٹاؤں کو
چراغ شام توہے ،شام کی ضرورت ہے

☆مبصر سے رابطہ: ریاض۔(سعودی عرب)
Mobile: +966598300320
❑❑❑

برمحل اشعار/زبان زد اشعار اوران کے ماخذ (جلد دوم)

مصنف ومحقق:خلیق الزماں نصرت
صفحات:368، قیمت:-/550،اشاعت:2024
ناشر: کائنات پبلی کیشن،15/4B سائی نگرکالونی،
بھیونڈی-421302(تھانے۔مہاراشٹر)
Mobile: 9923257606

——از: ایم نصراللہ نصر☆

ایک زمانے سے ایک لڑائی نما بحث چلی آرہی تھی کہ بیشتر زبانِ زد، برمحل اورآوارہ گرد اشعار کا اصلی خالق کون ہے، پتہ نہیں چلتا تھا۔ کوئی کہتا کہ یہ شعر فلاں کا ہے کوئی فلاں کا۔ دوسرا کوئی اور دعویٰ پیش کرتا اورکسی اور کے نام سے منسوب کرتا۔ قاری جس کی تخلیق پڑھتا اس پر ایمان رکھ لیتا ہرچند کہ وہ غلط ہوتا۔کبھی شعر میں ترمیم واضافہ کر دیا جاتا، الفاظ بدل دیے جاتے،کبھی کسی اور کا مصرع کسی اور میں جوڑ دیا جاتا۔نئی نسل کا قاری اس سے کافی پریشان تھا۔ لوگ تحریر وتقریر دونوں صورتوں میں غلط بیانی سے کام لیتے اوراب بھی یہی معاملہ ہے۔ خلیق الزماں نصرت نے اس دماغی خلل اورذہنی الجھن کو شدت سے محسوس کیا اورایک ایک شعر کی حقیقت کا پتہ لگانا شروع کیا اورایسے تقریباً دوہزار سے زائد اشعار کی اصلیت کا پردہ فاش کر دیا۔ نہ صرف اصلی خالق کا انکشاف کیا بلکہ اس کے کس مجموعے اوردیوان کی کس غزل میں وہ شعر ہے صفحہ نمبر کے ساتھ اکٹھا کرنا شروع کر دیا۔ جب کافی تعداد میں ایسے اشعار جمع ہو گئے تو انہیں مضامین اورکتابی شکل میں منظرعام پر لانا بھی شروع کر دیا۔ بلکہ اسے اپنے تحقیقی مقالے کا عنوان بھی طے کرلیا۔تحقیق کی سند تو نہیں لی مگر کام بڑا اوردستاویزی حیثیت کا کر دیا۔

شروعات میں آوارہ گرد اشعار، شاعر کوئی اور ہے،زبان زد اشعار پھر برمحل اشعار کے نام سے کتابیں منظرِعام پر آئیں۔ جب اشعارزیادہ ہو گئے تو دو دو جلدوں میں بھی کتابیں شائع کی گئیں۔ ان کی کتابوں میں شعوری رجحانات، آخری گھڑے کا پانی ،شعرائے بھیونڈی ،شعرائے مہاراشٹرا، برمحل اشعار اور ان کے ماخذ،مشہوراشعار گمنام شاعر (2011) برمحل اشعار، زبان زداشعار اور یہ نئی کتاب (2024) نے منظرعام پر آ کر دھوم مچارکھی ہے۔ اس کتاب کی خصوصیت بھی وہی ہے جو اس سے پہلے شائع ہوچکی ہیں لیکن اس میں تفصیلی گفتگو موجود ہے۔ ان کی اب تک کی مطبوعہ کتابوں کی تعداد تیس ہے اورمنتظراشاعت کے لیے دس کتابیں قطار میں کھڑی ہیں۔

نصرت صاحب نے اس کتاب کو منظرعام پر لا کر تحقیق کی دنیا میں تہلکہ مچا دیا ہے۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے جو بھی کام کیا ہے عرق ریزی، دیدہ ریزی اور سند کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ایسی تحقیق خال خال ہی نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر یحییٰ نشیط نے اس کتاب کو تحقیق کے خزانے میں بیش قیمت اضافہ قرار دیا ہے۔ اس میں جو برمحل اشعار کا انتخاب شامل کیا گیا ہے وہ لائق ستائش ہے۔ اس لیے کہ مختلف مواقع اور موضوعات پر بیشتر اشعارزبان زد ہیں۔ کسی کسی شعر کا تو ایک ہی مصرع مشہور ومقبول ہے لیکن موصوف نے مکمل شعر درج کر کے ہماری معلومات میں خاصہ اضافہ کیا ہے۔ ایسے اشعار کو انہوں نے آوارہ گرد اشعار بھی کہا ہے جن کی شناخت کافی مشکل تھی۔ کچھ اشعار تو ایسے ہیں جو ایک سے زائد شعرا کے نام سے منسوب ہیں۔ ان کی تحقیق کر کے نصرت صاحب نے اصل شاعر کا پتہ بتا دیا ہے۔ جیسے یہ اشعار جو غلطی سے کسی اور شاعر کے نام سے منسوب کر دیئے گئے ہیں:

وہ تو بتا رہا تھا کئی روز کا سفر
زنجیر کھینچ کر جو مسافر اتر گیا

یہ شعر'ادب گاہِ رامپور'کے ص10 پر ہوش نعمانی کے نام سے درج ہے لیکن منوررانا کے نام سے شہرت یافتہ ہے جو غلط ہے۔ انہوں نے وحید عرشی کی وفات پر ایک مضمون میں اس کے ثانی مصرع کو اپنا عنوان بنایا تھا۔

ہم نے اک شام چراغوں سے سجا رکھی ہے
شرط لوگوں نے ہواؤں سے لگا رکھی ہے

یہ شعر والی آسی کا ہے جو ان کے مجموعہ کلام'شہد' کے صفحہ 128 پر درج ہے۔

وہ آئے بزم میں اتنا تو فکرؔ نے دیکھا
پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

یہ شعر فکر یزدانی رامپوری کا ہے جو میر تقی میرؔ کے نام سے مشہور کر دیا گیا ہے۔

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

یہ شعر بسمل عظیم آبادی کا ہے جو غلطی سے رام پرساد بسمل کے نام سے منسوب ہو گیا ہے۔

تنگ دستی اگر نہ ہو سالکؔ
تندرستی ہزار نعمت ہے

یہ شعر غالبؔ کے شاگرد قربان علی سالک کی تخلیق ہے جو غالب کے نام سے مقبول ہو گیا ہے۔

عمر دراز مانگ کے لائے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں

یہ شعر بسمل عظیم آبادی کے مجموعۂ کلام 'حکایت ہستی' میں درج ہے لیکن عام خیال کے مطابق یہ بہادر شاہ ظفرؔ کے نام سے منسوب ہے جو غلط ہے۔

نور حق شمع الٰہی کو بجھا سکتا ہے کون
جس کا حامی ہو خدا اس کو مٹا سکتا ہے کون

یہ شعر (مولانا) اسلم جیراجپوری کا ہے جو غلطی سے علامہ اقبال کے نام سے منسوب ہو گیا ہے۔

خلیق الزماں نصرت نے ایسے اشعار کا بھی انکشاف کیا ہے جو اکثر اپنے خالق کے تعلق سے متنازع رہے ہیں۔ ان کے بارے میں اب تک یہ فیصلہ نہیں کیا جا سکا ہے کہ ان کا اصل خالق یا شاعر کون ہے۔ لیکن موصوف نے اپنی تحقیق و تلاش سے کافی حد تک مطمئن کر دیا ہے۔ مثالیں دیکھیں:

جلانے والے جلاتے ہی ہیں چراغ آخر
یہ کیا کہا کہ ہوا تیز ہے زمانے کی
(جمیل مظہری۔ فکر جمیل، ص33)

لوگ کہتے ہیں کہ فن شاعری منحوس ہے
شعر کہتے کہتے میں ڈپٹی کلکٹر ہو گیا

یہ شعر نادر لکھنوی کے مجموعۂ کلام میں محفوظ ہے مگر اس کی شہرت اکبر الہ آبادی کے نام سے ہوئی ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ اکبر الہ آبادی کا شعر ہے مگر یہ درست نہیں ہے۔

جب تلک جیتے رہے جاری رہا آنکھوں سے اشک
بعد مرنے کے بھی مدت تک یہ سیلابی رہا

مذکورہ شعر بھی تنازعہ کا شکار ہے۔ عام طور پر لوگ اسے میر تقی میرؔ کے نام سے منسوب کرتے ہیں لیکن درحقیقت یہ شعر میر محمد علی غافلؔ کا ہے جو ان کے کلام کے مجموعے نغز کے صفحہ 27 پر درج ہے۔

خدا کو بھول گئے لوگ فکر روزی میں
خیالِ رزق ہے رزاق کا خیال نہیں

یہ شعر بھی دوست محمد خلیلؔ کا ہے جو خم خانۂ جاوید کے صفحہ 47 پر درج غزل میں شامل ہے لیکن کسی اور کے نام سے مشہور ہو گیا ہے۔ بہت سے ایسے اشعار کی بازیافت بھی موصوف نے کی ہے جن کے بارے میں بیشتر قارئین کو علم نہیں۔ ایسے اشعار نہ کسی نے سنے ہوں گے یا پڑھے ہوں گے اگر سنا ہوگا تو شاعر کے نام کا پتہ نہ ہوگا۔

(مولانا) اسلم جیراج پوری کا یہ شعر کس نے نہیں سنا ہوگا:

نور حق شمع الٰہی کو بجھا سکتا ہے کون
جس کا حامی ہو خدا، اس کو مٹا سکتا ہے کون

یہ شعر تاریخ جیراج پوری کے صفحہ نمبر 42 پر نقش ہے لیکن زمانے میں مست کلکتوی یا کسی اور کے نام سے منسوب ہے۔

اس کتاب میں کچھ نیا کہنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تقریباً چار سو شعرا کے مشہور، مقبول اور زبان زد اشعار کا انتخاب شامل ہے ساتھ ہی ان شعرا کی مختصر سوانحی خاکہ بھی درج ہے۔ یہ ذرا الگ ہٹ کر کام کیا گیا ہے۔ اس کی تعریف ہونی چاہئے۔ جیسے:

ادا آئی، حیا آئی، غرور آیا حجاب آیا
ہزاروں آفتیں لے کر حسینوں کا شباب آیا
(نوح ناروی۔ سب رنگ شاعری، ص59)

کمبخت کبھی جی سے گزرنے نہیں دیتی
جینے کی تمنا مجھے مرنے نہیں دیتی
(نوح ناروی۔ ہزار رنگ، ص329)

اے دوست ہم نے ترک محبت کے باوجود
محسوس کی ہے تیری ضرورت کبھی کبھی
(ناصر کاظمی۔ کلیات ناصر کاظمی میں محبت کی جگی تعلق درج ہے۔ ص17)

کچھ یادگار شہر ستمگر ہی لے چلیں
آئیں ہیں اس گلی میں تو پتھر ہی لے چلیں
(کلیات ناصر، ص118)

مذکورہ خوبیوں اور کارہائے نمایاں کے پیش نظر اکابر ادب

نے اپنی گراں قدر رائے سے بھی ان کو نوازا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

''آپ کی کوشش قابل ستائش ہے اور اہل ذوق حضرات کے لیے ایک سند اور تسکین کا باعث ہے۔''

(مومن عمران، بھیونڈی)

''آپ نے بڑی عرق ریزی سے اس کی تحقیق کی ہے۔ یقیناً آپ کا یہ کام شعری تحقیق کا ایک روشن باب ہے۔''

(آصف اقبال، بھیونڈی)

''خلیق الزماں نصرتؔ نے اردو زبان و ادب کی آبیاری میں اپنی زندگی کا گراں قدر حصہ صرف کردیا۔'' (نذیر فتح پوری)

''آپ کا نام ادبی دنیا میں عزت و احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ آپ نے اپنی محنت سے یہ مقام حاصل کیا ہے۔''

(قاضی مشتاق احمد پونہ)

''خلیق الزماں نصرت کی ہمہ جہت شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ پیش نظر تحریر سے ان کا ادبی وشخصی گراف بلند ہوگا۔''

(شمیم قاسمی۔ پٹنہ)

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ نصرتؔ صاحب نے جو کام کیا ہے اس کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے۔ اس کی حیثیت دستاویزی ہے۔ یہ برسوں کا کام ہے۔ ایسے کام جگر سوزی، بیدار مغزی کے بغیر ممکن نہیں۔ اچھے اچھے محقق ایسے کام کو دیکھ کر دامن بچا کر نکل لیتے ہیں۔ یہ صرف سراہنے والا کام نہیں ہے بلکہ خطیر رقم، بڑے انعام و اعزاز کے وہ حقدار ہیں۔ ان کی خوب خوب پذیرائی ہونی چاہئے۔ استقبال ہونا چاہئے۔ اللہ ان کو لمبی حیات دے تاکہ وہ اور تحقیقی کام کرسکیں اور اردو تحقیق کا دامن وسیع سے وسیع تر کرسکیں۔ آمین!

☆مبصر سے رابطہ: (باوڑہ) Mobile: 9339976034

□□□

مظہر العلوم ایجوکیشنل چیریٹیبل ٹرسٹ (رجسٹرڈ) دہلی

شاہی امام مسجد فتح پوری دہلی مفکر ملت مفتی اعظم مولانا ڈاکٹر مفتی محمد مکرم احمد صاحب کی سرپرستی میں عوامی فلاح و بہبود کے مشن کو آگے بڑھاتے ہوئے مظہر العلوم ایجوکیشنل چیریٹیبل ٹرسٹ کا قیام عمل میں آچکا ہے، جس سے مستحقین اور ضرورت مند عوام، طلبا اور طالبات کی خدمت و معاونت کا سلسلہ جاری ہے۔ انکم ٹیکس ڈپارٹمنٹ کی طرف سے 12A اور 80G بھی مل گیا ہے۔ اس ٹرسٹ کا اصل مقصد مذہبی اور عصری تعلیم و تربیت کا فروغ، صحت اور انسانی خدمت ہے۔ مزید معلومات کے لیے موبائل نمبر پر رابطہ کیا جاسکتا ہے۔

حماد احمد

Mazharul Uloom Educational Charitable Trust (Regd.)

6479/11, G.F., Katra Bariyan, Fatehpuri, Delhi - 110006

Axis Bank (Chandni Chowk Branch)

A/c No. 920010070673650 IFSC: UTIB0000254

Bombay Mercantile Co-Operative Bank Limited

A/c No. 200100100068463 IFSC: BMCB0000044

The Trust has exemption from Income Tax Under 12A & 80G

Email: trust.mueducation@gmail.com

Mobile: 9899663435 / 9873684293

Advtt./02/2026

تحقیق و ترتیب: محمد عارف اقبال

پروفیسر احمد سجاد (ادیب، محقق)

رانچی یونیورسٹی (جھارکھنڈ) کے سابق صدر اور ڈین فیکلٹی آف ہیومنٹیز پروفیسر احمد سجاد اتوار 26 اپریل 2026 کو انتقال کر گئے۔ ان کی عمر تقریباً 87 برس تھی۔ وہ گزشتہ چند ماہ سے زیادہ علیل تھے۔ وہ چالیس برسوں تک شعبہ اردو سے وابستہ رہے اور رانچی یونیورسٹی کے ڈین فیکلٹی آف ہیومنٹیز کے عہدے سے ریٹائرڈ ہوئے۔ مرحوم کی اہلیہ کا ایک سال قبل ہی انتقال ہوا تھا، اس وقت پروفیسر صاحب نے اپنی اہلیہ کے جنازے کو کندھا بھی دیا تھا۔ ان کے پس ماندگان میں دو بیٹے اور تین بیٹیاں شامل ہیں۔ بڑے بیٹے طارق سجاد کول انڈیا لمیٹڈ میں ملازمت کرتے تھے اور وہیں سے حال ہی میں منیجر کے عہدے سے ریٹائرڈ ہوئے ہیں۔ مرحوم کی تدفین رانچی کے بریاتو پہاڑی قبرستان میں ہوئی۔

پروفیسر احمد سجاد 12 اکتوبر 1939 کو نالندہ ضلع کے سوہ دیہہ، سوہ سرائے میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم صغریٰ انگلش ہائی اسکول بہار شریف میں ہوئی۔ انہوں نے بالترتیب 1959 اور 1961 میں اردو اور فارسی میں ایم اے کی ڈگریاں حاصل کیں۔ 1972 میں رانچی یونیورسٹی سے 'مولانا حاذق ضیائی سہسرامی: جہات وخدمات' کے موضوع پر ان کو ڈی لٹ (اردو) کی سند دی گئی۔ ان کے اساتذہ میں کلیم الدین احمد، اختر اورینوی اور علامہ جمیل مظہری کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ موصوف اپنی تعلیم کے دوران میں NCC سے بھی وابستہ رہے اور سیکنڈ لیفٹیننٹ کے عہدے تک پہنچے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ پروفیسر احمد سجاد کا تعلق اس خاندان سے ہے جس کے افراد سیّد احمد بریلویؒ کی تحریک مجاہدین سے متاثر اور ان کے معاون رہے۔

ڈاکٹر احمد سجاد کا شمار اردو زبان و ادب اور تعلیم کی تحریکات کے رہنماؤں میں ہوتا ہے۔ ان کی نگرانی میں 6 سے زائد ریسرچ اسکالرز نے پی ایچ ڈی کے مقالے کی تکمیل کی۔ وہ تقریباً 25 علمی و ادبی، تحقیقی اور ثقافتی انجمنوں، اداروں اور تنظیموں کے رکن اور ذمہ دارانہ منصب پر فائز رہے۔ ڈاکٹر احمد سجاد اسلامک ایجوکیشن بورڈ (بہار و جھارکھنڈ)، تعلیمی و فلاحی ٹرسٹ 'مرکز ادب و سائنس' اور 'سجاد لائبریری رانچی' کے فاؤنڈر تھے۔ وہ ادارہ تحقیق و تصنیف علی گڑھ کی مجلس عاملہ کے رکن رہے۔ 1982 میں ادارہ ادب اسلامی ہند کے صدر منتخب ہوئے اور دس برسوں تک اس ادارہ کے کُل ہند صدر رہے۔ ڈاکٹر احمد سجاد ایمرجنسی (1975) کے بعد جماعت اسلامی ہند کے رکن بنے۔ جلد ہی ان کا شمار جماعت کے سرکردہ افراد میں ہونے لگا۔ وہ جماعت اسلامی ہند کی اعلیٰ اختیاراتی باڈی 'مجلس نمائندگان' کے رکن منتخب ہوئے۔ ساتھ ہی مرکزی مجلس شوریٰ (Central Advisory Council) کے بھی رکن منتخب ہوئے۔

ڈاکٹر احمد سجاد نے آسٹریلیا سے سعودی عرب تک درجنوں ممالک کے اسفار کیے اور وہاں کے سمینار اور سمپوزیم میں شرکت کی۔ انہوں نے اسلامک ڈیولپمنٹ بینک (IDB) جدّہ سے ہندوستانی طلبا کے لیے مالی امداد کی فراہمی میں اہم کردار ادا کیا۔ موصوف قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان (NCPUL) کے کمپیوٹر کورس کی تشکیلی مشاورت میں بھی شامل رہے۔ انہی کے دور میں پورے ملک میں NCPUL کی طرف سے کمپیوٹر کورس کے متعدد مراکز قائم کیے گئے۔ یہ مراکز آج بھی قائم ہیں۔ ڈاکٹر صاحب خدمت خلق سے بھی منسلک رہے اور اس میدان میں ہمیشہ فعال رول ادا کیا۔ ان کی ڈیڑھ درجن سے زائد کتابیں منظر عام پر آئیں جن میں داستان سحر البیان (شائع کردہ انجمن ترقی اردو، کراچی)، تنقید و تحریک، تعمیری ادبی تحریک: افکار و مسائل، بندہ مومن کا ہاتھ (سوانح عمری عاصم بہاری)، جھارکھنڈ میں اردو نثر اور شاعری کی سمت و رفتار: 1960 کے بعد، ہندوستان کا جدید تعلیمی انقلاب اور مسلم اقلیت، جدید نظریات کی کھلی ناکامی اور اسلام کا روشن مستقبل خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

پروفیسر احمد سجاد 'اردو بک ریویو' کو ایک دستاویزی مجلّہ کے طور پر بے حد پسند کرتے تھے۔ وہ اس کے لائف ممبر تھے۔

'اردو بک ریویو' کے جولائی تا ستمبر 2012 کے شمارہ میں موصوف کا ایک مختصر انٹرویو شائع ہوا تھا۔ جب ڈاکٹر صاحب سے دریافت کیا گیا کہ ''ملک میں اردو کی بنیادی اور حقیقی ترقی کے اہم نکات کیا ہو سکتے ہیں؟'' تو اُن کا جواب تھا ''اپنی نسلوں کو خواندہ بنانا، حکومت وقت سے دستوری حق لینا، کچھ خرچ کرنا۔'' جب سوال کیا گیا ''ملک میں اردو اکادمیوں اور اداروں کے ترقیاتی منصوبوں سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟'' تو ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا ''مٹھی بھر لوگوں کا فائدہ، مگر سوادِ اعظم کا نقصان اس لیے غیر مطمئن۔''

اللہ رب العزت مرحوم کی مغفرت فرمائے۔ ان کے حسنات کو شرفِ قبولیت بخشے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین!◆◆ (محمد عارف اقبال)

بشیر بدر (معروف وممتاز شاعر)

دور جدید کے منفرد اردو شاعر بشیر بدر کا جمعرات 28 مئی 2026 کی دوپہر بھوپال میں انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر تقریباً 91 سال تھی۔ وہ ایک طویل مدت سے صاحبِ فراش تھے۔ وہ 'ڈمنیشیا' کے مرض میں مبتلا تھے۔ ان کی یادداشت تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ بشیر بدر کا مشہور شعر ہے:

اُجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو
نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے

کہا جاتا ہے کہ ان کی شاعری ادب کی تاریخ میں 'اَمر' ہو گئی ہے اگرچہ وہ خود اپنے لکھے اشعار بھی بھول چکے تھے۔ ان کی پہلی اہلیہ کا 1984 میں انتقال ہو گیا تھا۔ دوسری شادی انہوں نے ڈاکٹر راحت سلطانہ سے کی جو معروف ادیبہ اور شاعرہ ڈاکٹر رضیہ حامد (بھوپال) کی چھوٹی بہن ہیں۔ ان کے پس ماندگان میں ڈاکٹر راحت سلطانہ کے علاوہ دو فرزند نصرت بدر، معصوم بدر کے علاوہ ایک دختر شامل ہیں۔ ان کی نماز جنازہ جمعرات ہی کو بعد نماز مغرب ادا کی گئی اور تدفین بھوپال کے 'بڑا باغ قبرستان' میں عمل میں آئی۔ کہا جاتا ہے کہ اُس وقت بہت کم تعداد میں لوگ موجود تھے۔ تاہم مصدقہ اطلاع ہے کہ تدفین کے وقت ایک سو سے زیادہ افراد حاضر تھے۔ افسوس کہ سوشل میڈیا پر نماز جنازہ اور تدفین میں کثیر تعداد پر جو حضرات لایعنی بحث کر کے کم علمی کا ثبوت دیتے ہیں ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ 'قربتِ الٰہی' کا معیار تعداد سے طے نہیں ہوتا۔ 'شہدا' کی مثال سامنے رکھنی چاہیے جن کی موت کے وقت شاید ہی چند افراد موجود ہوتے ہوں لیکن ان کا شمار اللہ رب العزت کے پسندیدہ بندوں میں ہوتا ہے۔

اردو شاعری کو وقار بخشنے والے بشیر بدر (مکمل نام: سیّد محمد بشیر) 15 فروری 1935 کو کانپور کے ایک محلہ 'بشیر گنج' میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم اتر پردیش کے مشہور شہر 'اِٹاوہ' کے اسکول میں ہوئی۔ وہیں انہوں نے شاعری کا آغاز کیا۔ 1967 میں گریجویشن اور 1969 میں ایم اے کے بعد بشیر بدر نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے پروفیسر آل احمد سرور کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ان کے تحقیقی مقالے کا عنوان ہے 'آزادی کے بعد اردو غزل کا تنقیدی مطالعہ'۔ یہ تحقیقی مقالہ 1981 میں انجمن ترقی اردو ہند (نئی دہلی) کے زیر اہتمام شائع ہوا۔

بشیر بدر نے اپنی مادرِ علمی (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) میں ملازمت بھی کی۔ اس کے بعد وہ میرٹھ یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے نہ صرف منسلک ہوئے بلکہ اس شعبے کے صدر بھی بنا دیے گئے۔ اس یونیورسٹی میں انہوں نے سترہ برس تک نسلِ نو کی ذہن سازی کی اور ان کے ذہن و قلب میں شعر و ادب کی چنگاری روشن کر دی۔ ان کی زندگی کا یہ غالباً پہلا بڑا سانحہ تھا جب 1987 کے میرٹھ فساد میں اُن کا گھر جلا دیا گیا۔ گھر کے جلنے پر بشیر بدر کا یہ شعر بہت مشہور ہوا:

لوگ ٹوٹ جاتے ہیں ایک گھر بنانے میں
تم ترس نہیں کھاتے بستیاں جلانے میں

اس کے بعد وہ بھوپال ہجرت کر گئے جہاں 28 مئی کو آسودہ خاک بھی ہوئے۔

ممتاز شاعر اور سینئر جرنلسٹ ندیم صدیقی (ممبئی) بشیر بدر کے انتقال کے بعد اپنے طویل مضمون میں لکھتے ہیں:

''بشیر بدر دورِ جدید کے علم سے منزہ تھے، اس جدّت کو انہوں نے فیشن کی طرح نہیں برتا، چونکہ وہ روایت کے تمام محاسن سے نہ صرف آشنا بلکہ ان کی بنیادوں پر نگاہِ غائر بھی رکھتے تھے اس لیے انہیں منزل شعر کے لیے اپنا راستہ بنانے میں

دشواری نہیں ہوئی۔ ان کی لفظیات وموضوعات ایسے تھے کہ اُس دور کے اکابر نہ صرف چونکے بلکہ ان کے تجربات کو قبول کرنے میں ایک تامل بھی مانع رہا، مگر بشیر بدر کی شعری جدّت اور ان کے اظہار کی تازگی کو بالآخر قبول ہی نہیں کیا گیا بلکہ نئی نسل کے لیے تو وہ شاعری کی ایک رہ بہار بن گئی۔

پتھر کے جگر والو! غم میں وہ روانی ہے
خود راہ بنالے گا بہتا ہوا پانی ہے''

بشیر بدر کی پہلی غزلوں کا مجموعہ'اکائی' (1969) دوسرا'امیج' (1973) اور تیسرا' آمد' تھا۔ دیگر مشہور مجموعوں میں' آس' اُجالے اپنی یادوں کے، اُجالوں کی پریاں، روشنی کے گھروندے، سات زمینیں ایک ستارہ، پھولوں کی چھتریاں، محبت خوشبو ہے، آہٹ اور' آسمان' شامل ہیں۔ تحقیقی کتابوں میں' آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ' اور' بیسویں صدی میں اردو غزل: حالی سے 1947 تک' قابلِ توجہ ہیں۔' کلیات بشیر بدر' بھی شائع ہو چکا ہے۔ علمی و ادبی ایوارڈ بھی ملے جن میں پدم شری ایوارڈ، ساہتیہ اکادمی ایوارڈ اور سنگیت ناٹک ایوارڈ شامل ہیں۔

بشیر بدر نے اردو غزل کو عوامی مقبولیت عطا کی۔ ان کی شاعری ہندوستان ہی نہیں بلکہ پاکستان، مشرق وسطیٰ اور پوری دنیا کے محبان اردو میں بے حد مقبول ہے۔ بشیر بدر کی شاعری اور شخصیت کے تعلق سے اردو کے مختلف رسائل اور جرائد نے گوشے اور نمبر بھی شائع کیے۔ ان میں یادگار سیماب ماہنامہ'شاعر' کا شمارہ بھی شامل ہے جو 1983 میں شائع ہوا تھا۔ ڈاکٹر رضیہ حامد نے بھی اپنے رسالہ' فکر و آگہی' کا ضخیم خاص نمبر شائع کیا تھا۔ اس نمبر میں معصوم مرادآبادی کا بشیر بدر سے ایک تفصیلی انٹرویو شامل ہے جو انہوں نے 1987 میں لیا تھا۔ معصوم مرادآبادی نے اپنے تعزیتی مضمون میں لکھا ہے کہ اس انٹرویو کے مشمولات پر کافی گرما گرم بحث بھی ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ مشفق خواجہ نے اس پر کالم بھی لکھا تھا۔ اس انٹرویو میں ڈاکٹر بشیر بدر نے کہا تھا کہ'' شاعری میں صرف میر و غالب ہی ان کے حریف ہیں، باقی کسی سے ان کا کوئی معاملہ نہیں ہے۔''

ندیم صدیقی نے اپنے مضمون میں بشیر بدر کی زندگی کے کئی اہم گوشوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''بشیر بدر کی شاعری، اُن کا فن دورِ حاضر ہی نہیں آئندہ کے لیے بھی' بدر کامل' ہے۔ یہ بڑی بات ہے۔ ان کی رحلت عجب تو نہیں مگر جانے والوں کا افسوس بھی فطری عمل ہے۔ اسی کے ساتھ خوشی کی بات یہ ہے کہ بشیر صاحب نے دنیا میں جتنی عمر بتائی وہ ہَوا ہوائی نہیں ہوئی۔ انہوں نے اپنی عمر کو زندگی بنا دیا۔ بشیر صاحب کامیاب شاعر ہی نہیں بلکہ ایک کامران شخص یوں بھی تھے کہ مرحوم نے زندگی سے بہت کچھ لیا ہی نہیں بلکہ بہت کچھ دے کر بھی گئے۔ شعر و ادب میں بھی گھس پیٹھ ہوتی ہے مگر یہ گھس پیٹھیے محفل ادب سے بڑی خاموشی سے وقت کے ہاتھوں باہر بھی کر دیے جاتے ہیں، بشیر بدر نے محفلِ ادب میں اپنی جگہ خود بنائی اور وہ جگہ ان کے بعد ٹھنڈی نہیں ہوگی۔

وہ کیسی سچی بات کہہ گئے ہیں:

میرے بستر پر سو رہا ہے کوئی
میری آنکھوں میں جاگتا ہے کوئی

یہ کوئی اور نہیں، بشیر بدر ہیں اور اُن کا فن اور اُن کا زمانہ ہے۔''

ندیم صدیقی لکھتے ہیں:

''کوئی نصف صدی پہلے ملک میں جدید شعری عمارت کے چار ستون محمد علوی، شہر یار، ندا فاضلی اور بشیر بدر سمجھے جاتے تھے۔ ان شخصیات میں آخرالذکر بشیر بدر کے ایک دو نہیں کئی اشعار زبان زد عام و خاص ہوئے۔'' مثلاً:

دشمنی جم کر کرو لیکن یہ گنجائش رہے
جب کبھی ہم دوست ہو جائیں تو شرمندہ نہ ہوں

کوئی پھول دھوپ کی پتیوں میں ہرے رِبن سے بندھا ہوا
وہ غزل کا لہجہ نیا نیا، نہ کہا ہوا، نہ سنا ہوا

مچھلیاں چل رہی ہیں پنجوں پر
جن کے چہرے ہیں لڑکیوں جیسے

ندیم صدیقی مزید لکھتے ہیں:

''جنسیات زندگی کا ایک' مدھر اور جیون ندیا کا بہتا دھارا ہے' اس دھارے میں بے سوچے سمجھے اُترنے والے ابتذال

کے بھنور میں ڈوب کر گندہ نالا بن جاتے ہیں مگر بشیر بدر کی فکر و خیال کے پرندوں نے اس دریا میں خوب خوب ڈبکیاں لگائیں اور اُبھر کر پاک وطاہر شعر کی صورت بن گئے۔

وہ غزل کی سچی کتاب ہے
اسے چپکے چپکے پڑھا کرو'

♦♦

سیّد شاہ حسین نہری (ممتاز شاعر وادیب)

اردو زبان وادب کے معروف وممتاز شاعر اور ادیب سیّد شاہ حسین نہری کا جمعرات 23 اپریل 2026 کو اورنگ آباد (مہاراشٹر) میں انتقال ہو گیا۔ ان کی عمر تقریباً 85 برس تھی۔ وہ گزشتہ کئی ماہ سے علیل تھے اور ان کی قوت گویائی متاثر ہوگئی تھی۔ مرحوم کی نماز جنازہ بعد نماز ظہر جامع مسجد بڑی لین میں ادا کی گئی اور تدفین بھڑ گیٹ کے قریب واقع قبرستان میں ہوئی۔

سیّد شاہ حسین نہری 12 فروری 1941 کو اورنگ آباد (دکن) میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم مدرسہ تحتانیہ چیلی پورہ، مدرسہ وسطانیہ جدید (نیو مڈل اسکول) اورنگ آباد اور سٹی ہائی اسکول، بھڑکل، اورنگ آباد میں ہوئی۔ انہوں نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز معین العلوم ہائی اسکول میں تدریسی خدمات سے کیا۔ اس کے بعد انہوں نے بل بھیم آرٹس، سائنس وکامرس کالج، بیڑ میں اردو لکچرر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ وہ ایک مخلص استاد تھے اور جماعت اسلامی کی تعلیمی کمیٹی کے رکن بھی رہے۔ معلم کی حیثیت سے اپنے علاقے میں وہ ممتاز مقام رکھتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی اردو ادب کے بےلوث خادم بھی رہے۔ علم عروض کے علاوہ عربی، فارسی اور اردو پر ان کو دسترس حاصل تھی۔ انہوں نے جہاں بچوں کے لیے نظمیں کہیں وہیں فن تاریخ گوئی میں ان کو کمال حاصل تھا۔ علم عروض اور ابجد پر ان کی دسترس نے انہیں اس فن میں ایک منفرد مقام عطا کیا۔ اورنگ آباد کی کئی معروف شخصیات پر یادگار قطعات تاریخ تخلیق کیے۔ جب راقم کے والد محترم جناب محمد محسن (مرحوم) 18 جون 2006 کو مظفر پور میں انتقال کر گئے تو سیّد شاہ حسین نہری (مرحوم) نے ان کی تاریخ وفات پر بھی قطعہ ارسال کیا تھا۔ یہ قطعہ تاریخ رحلت 'اردو بک ریویو' کے شمارہ ستمبر اکتوبر 2006 میں شائع ہوا تھا۔

سیّد شاہ حسین نہری صنف شاعری میں غزلیں، نظمیں، رباعیات، حمد، نعت اور منقبت سے خصوصی رغبت رکھتے تھے۔ وہ ایک متدین شاعر اور ادیب تھے۔ ان کی شاعری میں اخلاقی قدروں کو بنیادی حیثیت حاصل تھی۔ طلبا کے لیے انہوں نے ایک کتاب 'علم عروض اور منتخب بحریں' لکھی تھی جو بے حد مقبول ہوئی۔ مرحوم، ایک مخلص استاد اور عظیم شاعر ہونے کے ساتھ ایک شفیق، منکسر المزاج اور باوقار انسان تھے۔ ان کا شمار کہنہ مشق شعرا میں ہوتا تھا۔ ان کی شاعری میں سادگی، شعور کی گہرائی اور درد والم بجا طور سے محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ان کی ادبی محفلیں علم وفن کا گہوارہ ہوتی تھیں، جہاں نئے شعرا ان سے رہنمائی حاصل کرتے اور زانوئے تلمذ تہہ کرتے تھے۔ مرحوم نے اردو زبان وادب کی ترویج واشاعت کے لیے متعدد ادبی تنظیمیں قائم کیں۔ وہ باقاعدگی سے ادبی نشستوں کا اہتمام کیا کرتے تھے۔ بیڑ میں انجمن ترقی اردو کی شاخ کے قیام میں شاہ حسین نہری کا کلیدی کردار رہا ہے اور وہ اس کے معتمد بھی رہے۔ قادر پاشا مسجد میں موصوف کے خطاب کا اہل شہر بےچینی سے انتظار کیا کرتے تھے۔ ان کے شعری مجموعوں میں شب آہنگ، شب تاب، رباعیاتِ شاہ، سامانِ تسکین اور دیوانِ رباعیات شامل ہیں۔ چند ماہ قبل ہی موصوف کی خواہش پر 'کلیات شاہ' کی اشاعت ہوئی تھی جس کے اجرا میں اپنی علالت کے باوجود، اس تقریب میں مرحوم شاہ صاحب شریک ہوئے تھے۔ اس کتاب کی اشاعت میں ان کے داماد ڈاکٹر صفی انوری اور صاحبزادی نے اہم رول ادا کیا ہے۔ مرحوم کے پس ماندگان میں پروفیسر فرید احمد نہری (موظف)، پانچ بیٹیاں، پوتیاں اور نواسے شامل ہیں۔

شاہ حسین نہری گزشتہ دو برسوں سے 'اردو بک ریویو' کی مجلس مشاورت کے رکن تھے۔ اس مجلّہ سے ان کو غیر معمولی اُنسیت تھی۔ اس کی بقا کے لیے ہمیشہ فکر مند رہتے اور تعاون بھی کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ 'اردو بک ریویو' کے شمارہ اپریل تا جون 2009 میں شاہ حسین نہری کے مختصر تعارف کے ساتھ انٹرویو شائع ہوا تھا۔ ان سے ایک سوال کیا گیا کہ'' آپ

کے پسندیدہ ناول نگار کون ہیں؟'' تو مرحوم کا جواب تھا۔ ''ناول سے زیادہ دلچسپی نہیں رہی۔ ادب کا طالب ہوں اس لیے پڑھتا رہا ہوں۔ پریم چند، قرۃ العین حیدر، عبداللہ حسین اور نظر زیدی وغیرہ کے ناول پڑھے ہیں اور ہاں! ابن صفی کا کوئی ناول جب بھی ہاتھ لگا ہے، فوراً پڑھ لیا ہے۔'' جب دریافت کیا گیا ''بچوں کے لیے لکھی گئی کس کتاب کو آپ پسند کرتے ہیں؟'' تو جواب ملا ''مائل خیرآبادی اور افضل حسین کی کتابیں۔''

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین!◆◆ (محمد عارف اقبال)

ڈاکٹر محمد فیروز دہلوی (محقق، ناقد، ادیب)

اردو کے محقق، ناقد، ممتاز مصنف اور ادبیات کے ہر دلعزیز استاد ڈاکٹر محمد فیروز دہلوی طویل علالت کے بعد جمعہ 15 مئی 2026 کو شام ساڑھے چھ بجے کے قریب (نماز مغرب سے قبل) انتقال کر گئے۔ وہ برسوں سے سانس کے مرض میں مبتلا تھے۔ انہوں نے اپنی رہائش گاہ دریا گنج (واقع کوچہ دکھنی رائے) میں آخری سانس لی۔ ان کی عمر تقریباً 84 برس تھی۔ ایک عرصے تک انہوں نے ذاکر حسین کالج میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیے۔ فیروز دہلوی لاولد تھے۔ پس ماندگان میں صرف ان کی اہلیہ (ایم اے، بی ایڈ ٹیچر) باحیات ہیں۔ مرحوم کی تدفین 16 مئی کی صبح دس بجے دلّی گیٹ قبرستان میں ہوئی۔

ڈاکٹر محمد فیروز دہلوی 5 نومبر 1942 کو شرفاء دلّی کے ایک خوش حال، تعلیم یافتہ اور دین دار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ لیکن اس گھرانے کی خوش حالی 1947 کے فرقہ وارانہ فسادات کی نذر ہوگئی۔ بہ مشکل ہائر سکنڈری پاس کرنے کے بعد وہ چھوٹی ملازمت اور ٹیوشن پر اکتفا کرنے لگے۔ ڈاکٹر فیروز دہلوی کو مضمون نگاری کا ذوق آٹھویں کلاس ہی سے رہا ہے اور اسی زمانے سے ان کے مضامین رسائل میں چھپنے لگے تھے۔ لیکچرر ہونے سے قبل موصوف نے اردو کے مختلف جرائد میں کلرک، سب ایڈیٹر اور ایڈیٹر کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ 13 سال بعد دہلی کالج (ایوننگ کلاسیز) میں بی اے (آنرز) میں داخلہ لیا۔ کالج کے زمانہ طالب علمی میں انہوں نے کالج کے سالنامہ رسالے حیات کا یادرفتگاں نمبر بھی شائع کیا تھا۔ تعلیم کے دوران میں کسی استاد نے ایم اے اور پی ایچ ڈی کرنے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ ایوننگ کلاسیز سے ایم اے کرنے کے بعد موصوف کا 1983 میں ذاکر حسین کالج (ایوننگ) میں عارضی طور سے تقرر ہوگیا۔ اس کے بعد اسی کالج (مارننگ) میں ان کی ملازمت مستقل ہوگئی۔ انہوں نے ملازمت کے دوران میں ہی ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کی تھیں۔ انہوں نے اپنا تحقیقی مقالہ مرزا غالب کے چہیتے شاگرد میر مہدی مجروح دہلوی کے موضوع پر تحریر کیا تھا۔

ڈاکٹر فیروز دہلوی 4 نومبر 2007 کو 65 سال کی عمر میں ذاکر حسین کالج سے بحیثیت سینئر ریڈر سبکدوش ہوئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد وہ تصنیف و تالیف میں مصروف ہو گئے نیز ٹی وی اور آل انڈیا ریڈیو سے دہلی کی تاریخ، تہذیبی زندگی اور اہم شخصیات پر ان کے مضامین و مباحثے بھی نشر ہوتے رہے۔ وہ ایک ممتاز مصنف کے ساتھ مترجم بھی تھے۔ ذاکر حسین کالج میں اپنے طلبا کے درمیان ہر دلعزیز استاد تھے۔ فیروز دہلوی کی چند تصنیفات ذیل میں ملاحظہ کریں:

میر مہدی مجروح: حیات اور تصانیف، اختر الایمان: مقام اور کلام، مجروح سلطانپوری: مقام اور کلام، سجاد ظہیر کے ناولٹ لندن کی ایک رات کا تجزیاتی مطالعہ، سردار جعفری کی نادر تحریریں (نثر)، سماجیات (سماجی علوم پر نصابی کتاب)، میر باقر علی داستان گو (تحریری مقالہ)، مثنوی زہر عشق (تجزیاتی مطالعہ مع فرہنگ)، یہ بھی تھی دلّی (1837 سے 1947 تک کے تہذیبی مرقعے)، امرجیوتی: ہندوستانی سنتوں کی کہانیاں (ترجمہ)، سائل دہلوی: مونوگراف (2024)۔ انہوں نے کئی شعرا کے مجموعہ ہائے کلام بھی مرتب کیے جن میں علامہ زار دہلوی، یادگارِ داغ کے صاحبزادے خار دہلوی، اور کالج کے سینئر استاد اور کہنہ مشق شاعر مغیث الدین فریدی کے شعری مجموعے شامل ہیں۔

ڈاکٹر فیروز دہلوی کی ادبی خدمات کے اعتراف میں ایوارڈز و اعزازات بھی عطا کیے گئے۔ دہلی اردو اکادمی نے مجموعی خدمات پر دتاتریہ کیفی ایوارڈ سے نوازا تھا۔ فیروز صاحب خاموش طبع اور

باوقار انسان تھے۔ حفظ مراتب کا خاص خیال رکھتے تھے۔ وہ دلّی والے تھے اور ان کی شخصیت موجودہ دلّی والے کے لیے مثالی تھی۔ زبان کے معاملے میں بے حد محتاط تھے۔

ڈاکٹر فیروز دہلوی مجلّہ 'اردو بک ریویو' کے نہ صرف قاری تھے بلکہ اس کے لیے انہوں نے درجنوں کتابوں پر تبصرے کیے۔ جب طبیعت زیادہ علیل ہونے لگی تو معذرت کرلی تھی۔ ان کا غالباً آخری تبصرہ 'عتیق مظفر پوری: حیات و خدمات' پر (جنوری تا مارچ 2025) شائع ہوا تھا۔ مرحوم کبھی کبھی خاص فرمائش پر کم سے کم وقت میں کسی کتاب پر تبصرہ کرنے میں مہارت رکھتے تھے۔

'اردو بک ریویو' (شمارہ اکتوبر، نومبر، دسمبر 2009) میں 'کتاب زندگی' کالم میں فیروز دہلوی صاحب کا ایک مختصر انٹرویو شائع ہوا تھا۔ ان سے ایک سوال کیا گیا کہ '' آپ کی زندگی میں کس کتاب سے انقلابی تبدیلی رونما ہوئی ؟'' تو ان کا جواب تھا '' قرآن مجید۔'' جب یہ سوال کیا گیا کہ '' کیا اپنے ملک کی تعلیمی ترقی سے مطمئن ہیں؟'' فیروز صاحب نے یوں جواب دیا '' بے شمار جامعات، تعلیمی ادارے، سائنسی اور جدید علوم کی وسعت کے باوجود تعلیمی ترقی اطمینان بخش نہیں ہے۔ یہ ادارے کردار سازی میں بہت پیچھے ہیں۔''

اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرما کر، ان کے حسنات کو شرف قبولیت عطا کرے اور جنت الفردوس میں داخل کرے۔ آمین! ♦♦ (محمد عارف اقبال)

الطاف حسن قریشی

(سینئر صحافی، بانی ایڈیٹر اردو ڈائجسٹ، لاہور)

معروف دانشور اور سینئر صحافی الطاف حسن قریشی سنیچر 16 مئی 2026 کو لاہور میں انتقال کر گئے۔ ان کی عمر تقریباً 94 سال تھی۔ ان کی نماز جنازہ 17 مئی کو جامعہ اشرفیہ لاہور میں ادا کی گئی۔ ان کی اہلیہ کا انتقال نومبر 2024 میں ہو گیا تھا۔

الطاف حسن قریشی 3 مارچ 1932 کو حصار میں (برٹش انڈیا کے صوبہ پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ 1947 میں وہ پاکستان ہجرت کر گئے اور لاہور کو اپنا مسکن بنایا۔ انہوں نے یونیورسٹی آف پنجاب سے پولیٹکل سائنس میں ایم اے کی ڈگری لی تھی۔ الطاف حسن قریشی نے بحیثیت صحافی اپنے کریئر کا آغاز اس وقت کیا جب پاکستان میں کمیونزم اور اسلام کا تنازع اپنے عروج پر تھا، بالخصوص 1960 اور 1970 کے درمیان۔ الطاف حسن قریشی ایک اسلام پسند صحافی تھے اور تحریک اسلامی کے بانی سیّد ابوالاعلیٰ مودودی کی تحریروں سے خاص طور سے متاثر تھے۔ ان کے مضامین پاکستان کے موقر روزناموں بالخصوص 'جنگ' میں شائع ہوا کرتے تھے۔

معروف مجلّہ 'اردو ڈائجسٹ' لاہور کا اجرا الطاف حسن قریشی کے بڑے بھائی اعجاز حسن قریشی نے 1959 میں کیا تھا اور اس کے پہلے مدیر بھی ہوئے۔ اپنے دفتر میں ایڈیٹوریل کی ذمہ داری اعجاز حسن قریشی اب بھی بہ حسن وخوبی ادا کر رہے ہیں۔ الطاف حسن قریشی اور ان کے بھائی اعجاز حسن قریشی اپنے افکار و نظریات کے سبب حکومت کی طرف سے کئی بار پابند سلاسل کیے گئے۔ جب مشرقی اور مغربی پاکستان کی علاحدگی کا مسئلہ اپنے شباب پر تھا تو الطاف حسن قریشی کی تحریروں نے ملک کے مختلف مکاتب فکر کو خاص طور پر متوجہ کیا۔ 'اردو ڈائجسٹ' میں الطاف حسن قریشی کے انٹرویوز نے بھی اپنے قارئین کو بے حد متاثر کیا۔ معروف صحافی افتخار گیلانی (انقرہ، ترکیہ) اپنے تاثرات میں لکھتے ہیں کہ اپنے انٹرویو میں '' وہ الفاظ سے منظر کشی کرتے تھے، جس میں وہ انٹرویو دینے والے کے اردگرد کے ماحول، اشاروں، کیفیت اور شخصیت کو اس قدر واضح طور پر بیان کرتے تھے کہ قاری خود کو اس کمرے میں موجود محسوس کرتا تھا اور گفتگو کا براہ راست مشاہدہ کرتا تھا۔''

الطاف حسن قریشی کو حکومت پاکستان کی جانب سے 'ستارہ امتیاز' کے اعزاز سے نوازا گیا۔ ان کی چند کتابوں کے نام اس طرح ہیں:

جنگ ستمبر کی یادیں (یادداشت، ہند و پاک جنگ 1965)، مقابل ہے آئینہ، چھ نکات کی سچی تصویر، مزید ملاقاتیں، ملاقاتیں کیا، کیا (معروف شخصیات کے انٹرویوز)، نوکِ زبان۔

کہا جاتا ہے کہ 'اردو ڈائجسٹ' پاکستان کا پہلا ڈائجسٹ تھا

جس کا انداز معروف امریکن ماہنامہ ریڈرس ڈائجسٹ (Reader's Digest) جیسا تھا۔'اردو ڈائجسٹ' میں موضوعات کا تنوع ہوتا ہے۔ اردو زبان و ادب کے ساتھ اس نے کردار سازی میں مثالی کردار ادا کیا۔ سائنس اینڈ ٹکنالاجی، تاریخ، تعلیم، صحت عامہ، حیوانات و نباتات اور مثالی تجارت اور مثبت سوچ کو فروغ دینے میں یہ ڈائجسٹ اپنے قارئین میں بے حد مقبول ہے۔ اس کے رہنما مدیران (Pioneers) میں جہاں ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی، الطاف حسن قریشی اور ملک ظفر اللہ خاں کے اسمائے گرامی قابل توجہ ہیں وہیں اس کے معاون مدیران کی حیثیت سے آباد شاہ پوری، مقبول جہانگیر، ضیا شاہد، محسن فارانی، سیّد عاصم محمود اور اختر عباس منسلک رہے۔ اس وقت 'اردو ڈائجسٹ' کے مینیجنگ ایڈیٹر طیب اعجاز ہیں۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور ان کے حسنات کو شرف قبولیت عطا فرمائے۔آمین! ♦♦ (محمد عارف اقبال)

ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری (ممتاز ماہر معاشیات وفلسفہ)

ممتاز ماہر معاشیات وفلسفہ ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری بدھ 18 مارچ 2026 کو مشی گن (امریکہ) میں انتقال کر گئے۔ ان کی عمر تقریباً 81 برس تھی۔ وہ پوری زندگی اسلامی کاز کے لیے کام کرتے رہے۔ ان کا مقصد ہمیشہ اقامتِ دین رہا۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ انہوں نے کیمونزم کا تفصیلی مطالعہ کیا تھا۔ کارل مارکس، لینن اور ماؤ کی تمام کتابوں کا گہرائی سے مطالعہ کیا تھا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ عہد حاضر میں اسلام کا مقابلہ کیمونسٹوں سے نہیں بلکہ لبرل ازم اور سرمایہ دارانہ نظام سے ہے۔

ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری 20 نومبر 1945 کو ناگپور (برٹش انڈیا) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ہمایوں اختر انڈین سول سروس میں تھے۔ تقسیم ہند کے وقت ان کے والد پاکستان آ گئے تھے۔ جاوید اکبر انصاری کی ابتدائی تعلیم سینٹ پیٹرکس میں ہوئی۔ بی اے (آنرز) اور ایم اے (معاشیات) کراچی یونیورسٹی سے کیا۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلینڈ گئے۔ کیمبرج یونیورسٹی سے ایم ایس سی کے بعد یونیورسٹی آف سسکس سے کارل مارکس اور اس کے معاشی فلسفے پر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اسی یونیورسٹی سے فلسفہ میں پی ایچ ڈی کی ڈگری لی جو ان کی دوسری پی ایچ ڈی تھی۔ برطانیہ میں قیام کے دوران انہوں نے یونیورسٹی کالج آف اکنامکس، کنگز کالج آف لندن یونیورسٹی، سسکس یونیورسٹی اور لندن اسکول آف اکنامکس میں تدریسی خدمات بھی انجام دیں۔

جاوید اکبر انصاری کے والد ہمایوں اختر وفاقی حکومت میں ڈپٹی آڈیٹر جنرل کے اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ ان کی رہائش گاہ ایک زمانے میں جماعت اسلامی کے معروف رہنما پروفیسر خورشید احمد (ماہر معاشیات) کے قریب تھی۔ پروفیسر خورشید احمد زمانہ طالب علمی میں اسلامی جمعیت طلبا کے ناظم اعلیٰ بھی رہ چکے تھے۔ قربت داری کے سبب دونوں خاندان کا ایک دوسرے کے گھر آنا جانا تھا۔ اس وقت جاوید اکبر کی عمر 16-15 سال تھی اور وہ اسکول کے طالب علم تھے۔ پروفیسر خورشید احمد کی تحریک پر ہی جاوید اکبر کم عمری میں اسلامی جمعیت طلبا میں شامل ہو گئے۔

ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری اقوام متحدہ (UNO) کے ایک ادارے یو این انڈسٹریل ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن میں ڈائرکٹر رہے جس کا دفتر ویانا (آسٹریا) میں تھا۔ 1989 میں وہ ویانا سے کراچی آ گئے اور خود کو تعلیمی اور تصنیفی مصروفیات تک محدود کر دیا۔ انہوں نے کراچی میں کئی تعلیمی اداروں کی بنیاد رکھنے میں سرگرم حصہ لیا۔ ان میں کے بی ایم (کالج آف بزنس مینجمنٹ)، کے آئی ای ٹی (کراچی انسٹی ٹیوٹ آف اکنامکس اینڈ ٹیکنالاجی) اور صفا یونیورسٹی شامل ہیں۔ جاوید اکبر انصاری نے تدریس کے ساتھ اپنا ایک فکری حلقہ 'دبستانِ جاوید اکبر انصاری' قائم کیا تھا۔ یہ ایک موثر پلیٹ فارم تھا جس کے ذریعے جاوید اکبر کے لیکچرز زوم کے ذریعے ساری دنیا میں سنے جانے لگے۔ ان کی کئی تصانیف منظر عام پر آئیں۔ ان کی مشہور کتابوں میں 'Rejecting Freedom and Progress'، مغربی تہذیب کا اساسی نظام اور اس کی استعماری توسیع: سرمایہ دارانہ نظام، سرمایہ داری کیا ہے؟، جمہوریت کی حقیقت، فلسفہ جدید کی مغربی تقسیم، سرمایہ داری کے نقیب شامل ہیں۔ انہوں نے بڑے مدلل انداز میں ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ موجودہ دور میں اسلام کو سوشلزم سے زیادہ سرمایہ دارانہ نظام

سے خطرہ ہے۔

جاوید اکبر انصاری کراچی یونیورسٹی میں اپنے زمانہ طالب علمی کے دوران میں اسلامی جمعیت طلبا کے باصلاحیت اور کامیاب ناظم تھے۔ انگریزی اور اردو کے بہترین مقرر ہونے کے ساتھ ساتھ ہر کام سوچ سمجھ کر اور منصوبہ بندی کے ساتھ کرتے تھے۔

ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری کے درجنوں لائق و فائق شاگرد ہوئے جن میں معروف اسکالر اور مصنف خالد جامعی بھی شامل ہیں۔ ان کے پس ماندگان میں اہلیہ انجم انصاری اور دو بیٹوں بیرسٹر حسین انصاری اور محمد متین انصاری شامل ہیں۔ ♦♦

(فرائڈے اسپیشل کراچی، مارچ 2026، عارف الحق عارف کے طویل مضمون سے ماخوذ)

پروفیسر محمد شاہد حسین (ناقد، محقق، مصنف)

اردو کے ممتاز محقق، ناقد، ڈرامہ نگار اور ہر دل عزیز استاذ پروفیسر محمد شاہد حسین بدھ 20 مئی 2026 کو دہلی کے میکس ہسپتال میں انتقال کر گئے۔ جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی شعبہ اردو کے سابق استاذ پروفیسر شاہد حسین نے طویل مدت تک درس وتدریس کا فریضہ انجام دیا۔ ان کی تدفین 21 مئی 2026 کو دوارکا قبرستان، سیکٹر 24، نئی دہلی میں ہوئی۔ ان کی اہلیہ کا کووڈ:19 کے دوران انتقال ہو گیا تھا۔ ان کے پس ماندگان میں دو بیٹے ہیں۔

پروفیسر محمد شاہد حسین ولد خادم حسین 12 فروری 1949 کو گورکھپور (یوپی) کے ایک زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ گورکھپور یونیورسٹی سے 1976 میں اردو میں ایم اے کے بعد جواہر لعل نہرو یونیورسٹی سے 1978 میں ایم فل کیا۔ اسی یونیورسٹی سے 1982 میں پی ایچ ڈی کی تکمیل ہوئی۔ انہوں نے یو جی سی ریسرچ ایسوسی ایٹ (1982 تا 1985) کے بعد ریسرچ سائنٹسٹ A، اور ریسرچ سائنٹسٹ B کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ انہوں نے 1986 میں دہلی یونیورسٹی سے فارسی میں بھی ایم اے کی ڈگری حاصل کی تھی۔

پروفیسر شاہد حسین کی تصنیفات میں اندر سبھا کی روایت (1984)، اندر سبھا کی پرمپرا (ہندی، 1990)، عوامی روایات اور اردو ڈراما (1992)، ڈراما فن اور روایت (1994)، ابلاغیات (2003)، جن سنچار پرمپرا اور پریوگ (ہندی، 2010)، اکتباسات (مضامین کا مجموعہ، 2013)، سیّد امتیاز علی تاج (مونوگراف، 2017)، اردو ڈرامے کی فکری وفنی اساس (2019)، اک طرفہ تماشا (ڈراموں کا مجموعہ، 2023) شامل ہیں۔ ان کی مرتبہ کتابوں میں اردو اور عوامی ذرائع ابلاغ (2007)، مولانا ابوالکلام آزاد: نادر تحریریں (2008)، انارکلی (2017)، اندر سبھا (2017) قابل ذکر ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ پروفیسر شاہد حسین کے انتقال سے اردو دنیا، بالخصوص اردو ڈرامہ کی تنقید وتحقیق کے میدان میں ایک بڑا خلا پیدا ہو گیا ہے جسے پُر کرنا آسان نہیں۔ اردو ڈرامے کی دنیا کا وہ ایک معتبر نام تھے۔ ان کی خدمات کو ناقابل فراموش خیال کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر شفیع ایوب کے مطابق مرحوم اپنی کتاب 'اک طرفہ تماشا' کا نیا ایڈیشن شائع کرنا چاہتے تھے لیکن اجل نے ان کو مہلت نہ دی۔ ♦♦

(ڈاکٹر عمیر منظر کی فراہم کردہ معلومات سے ماخوذ)

امین الدین ابوالحسن (لائف ممبر، اردو بک ریویو)

اردو بک ریویو کے لائف ممبر جناب امین الدین ابوالحسن سنیچر 4 اپریل 2026 کو چنئی (تمل ناڈو) میں انتقال کر گئے۔ ان کی عمر تقریباً 80 برس تھی۔ وہ کئی برسوں سے علالت کے سبب گھر تک محدود ہو گئے تھے۔

امین الدین ابوالحسن بن جناب مرتضیٰ حسین یکم جنوری 1946 کو شہر مدراس (موجودہ چنئی) میں پیدا ہوئے۔ ان کے دادا سالار الملک محمد حبیب اللہ تھے اور نانا جناب غوث مرتضیٰ نظام حیدرآباد (دکن) کے وزیر دفاع تھے۔ ان کی شادی ان کی خالہ زاد بہن وسیمہ سے ہوئی تھی۔ ان کی اہلیہ محترمہ وسیمہ عالم اسلام کے معروف اسلامی اسکالر اور بین الاقوامی داعی اسلام ڈاکٹر محمد حمید اللہ (علیہ الرحمہ) کی برادرزادی ہیں۔

امین الدین ابوالحسن کی تعلیم چنئی مدرسہ اعظم میں ہوئی اور محمڈن کالج سے ان کو ڈگری دی گئی۔ بعد ازاں عثمانیہ یونیورسٹی

(حیدرآباد) سے انہوں نے ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ انگریزی سے اردو زبان میں انہوں نے کئی نصابی کتابوں کے ترجمے کیے تھے۔ پیشے کے اعتبار سے امین الدین ابوالحسن اسکول ٹیچر تھے۔ چنئی کے قدیم معروف اسکول مدرسہ اعظم میں وہ ریاضی کے استاد رہے۔ وہاں انہوں نے تقریباً 35 برس تدریسی خدمات انجام دیں۔ ان کے درجنوں ہونہار شاگرد زندگی کے مختلف میدانوں میں کارہائے نمایاں انجام دے رہے ہیں۔ امین الدین (مرحوم) نہایت نفیس طبیعت اور پُرخلوص فطرت کے مالک تھے۔ اپنے طلبا کے لیے وہ محبت اور اخلاص کا پیکر تھے۔ مزاج میں سادگی اور خاکساری تھی۔ اردو زبان وادب سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ 'اردو بک ریویو' کے تاحیات ممبر خود بھی بنے اور چنئی میں اپنے رفقا کو اس کے لیے راغب کیا۔ وہ اردو بک ریویو کی خدمات اور دستاویزی حیثیت کے نہ صرف معترف تھے بلکہ اس کے مخلص معاونین میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ بستر علالت پر بھی 'اردو بک ریویو' کا تازہ شمارہ ملتے ہی مطالعہ شروع کر دیتے تھے۔ کبھی فون پر اپنے تاثرات سے بھی آگاہ کرتے تھے۔

مرحوم کی نماز جنازہ بعد نماز مغرب ادا کی گئی اور تدفین درگاہ حضرت دستگیر صاحب میں عمل میں آئی۔ جنازے میں کثیر تعداد میں ان کے طلبا شریک تھے جو مرحوم کے اعلیٰ کردار کا تذکرہ کرتے تھے۔ ان کے پس ماندگان میں صرف اہلیہ ہیں۔ اللہ نے مرحوم کو اولاد سے نہیں نوازا تھا۔ مرحوم تاحیات صبر اور شکر کی مجسم تصویر بنے رہے۔

اللہ رب العزت مرحوم کی مغفرت فرما کر جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین! ♦♦ (محمد عارف اقبال)

(نوٹ: مضمون کی ترتیب مرحوم کے ایک خاص شاگرد فرید احمد صاحب کی مہیا کردہ معلومات پر مبنی ہے۔ فرید احمد صاحب خود چنئی کے ایک اسکول میں استاد ہیں)

ڈاکٹر محمد گوہر (ایڈیٹر روزنامہ 'تاثیر')

اردو اخبار روزنامہ 'تاثیر' کے پبلشر اور ایڈیٹر ڈاکٹر محمد گوہر ولد محمد نظام الدین (مرحوم) کا منگل 5 مئی 2026 کی صبح رانچی (جھارکھنڈ) کے ایک نجی ہسپتال میں انتقال ہو گیا۔ ان کی عمر تقریباً 52 سال تھی۔ پس ماندگان میں اہلیہ اور دو بچے شامل ہیں۔ ان کا جسد خاکی رانچی سے پٹنہ کے بکسریا ٹولہ میں واقع آبائی مکان میں لایا گیا۔ نماز جنازہ بعد نماز عشا ابرار کریم قاسمی نے پڑھائی۔ تدفین متھنی قبرستان میر شکار ٹولی پٹنہ میں عمل میں آئی۔ نماز جنازہ میں صحافی برادری کے علاوہ سرکردہ سیاسی شخصیات، جماعت اسلامی حلقہ بہار کے امیر اور خانقاہ شاہ ارزانی کے سجادہ نشیں ڈاکٹر سید شاہ حسین احمد بھی موجود تھے۔ ان کے انتقال پر آر جے ڈی کے صدر لالو پرساد سمیت سرکردہ شخصیتوں نے گہرے صدمے کا اظہار کیا۔

ڈاکٹر محمد گوہر 20 نومبر 1976 کو پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے کمپیوٹر سائنس میں ایم ٹیک کی ڈگری حاصل کی تھی۔ جرنلزم اینڈ ماس کمیونی کیشن میں پوسٹ گریجویشن کی ڈگری لی تھی۔ فخر الدین عارفی کے مطابق ڈاکٹر گوہر MBA اور MCA کے ساتھ پی ایچ ڈی بھی تھے۔

روزنامہ 'تاثیر' ملک کے 14 مراکز سے بیک وقت شائع ہوتا تھا۔ ان مقامات میں پٹنہ کے علاوہ بھاگل پور، کولکاتا، رانچی، گوہاٹی، بنگلور، بھوپال شامل ہیں۔ یہ اخبار گزشتہ 13 سال سے مستقل شائع ہو رہا ہے۔ ڈاکٹر گوہر پریس ایڈوائزری کمیٹی بہار لیجسلیٹیو کونسل کے نامزد رکن تھے۔ مغربی بنگال اردو اکیڈمی نے ڈاکٹر گوہر کو 2016 میں 'منشی پریم چند ایوارڈ' سے نوازا تھا۔ اردو نفاذ کمیٹی پٹنہ کی جانب سے 'آفتاب صحافت' ایوارڈ بھی دیا گیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ڈاکٹر گوہر نے زرد صحافت (Yellow Journalism) سے ہمیشہ اپنے دامن کو بچایا۔ نظریاتی اختلاف کو ذاتی اختلاف تصور نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے دنیا کے تقریباً 35 ممالک کی سیر کی تھی جن میں امریکہ، انگلینڈ، کنیڈا، جاپان، مصر، فرانس، اٹلی، قطر، ترکیہ، بنگلہ دیش، ملیشیا، آسٹریلیا وغیرہ شامل ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ ڈاکٹر محمد گوہر اردو کے ایک ایسے مایہ ناز اور باکمال صحافی تھے جنہوں نے اردو میں غیر جانب دار اور صحت مند صحافت کے فروغ و ارتقا میں اہم کردار ادا کیا۔ ہر اتوار کو 'تاثیر' کا ادبی ایڈیشن بھی شائع ہوتا تھا جس کی ترتیب و تہذیب کا فریضہ سینئر صحافی امتیاز کریم انجام دیتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ مرحوم ڈاکٹر گوہر کی مغفرت فرمائے۔ آمین! ♦♦

محسنہ قدوائی (کانگریس کی سینئر لیڈر اور سابق مرکزی وزیر)

کانگریس کی سینئر لیڈر اور سابق مرکزی وزیر محسنہ قدوائی کا بدھ 8 اپریل 2026 کی شب دہلی NCR (نوئیڈا) کے ایک نجی ہسپتال میں انتقال ہوگیا۔ وہ کچھ عرصے سے علیل تھیں۔ ان کی عمر تقریباً 94 سال تھی۔ محسنہ قدوائی طویل عرصے تک ہندوستانی سیاست میں سرگرم رہیں۔ وہ اپنی صاف شبیہ، عوامی خدمت اور خواتین کی فلاح و بہبود کے لیے کی جانے والی کوششوں کے حوالے سے اپنی شناخت رکھتی تھیں۔ ان کا شمار کانگریس کے باوقار اور تجربہ کار قائدین میں ہوتا تھا۔

محسنہ قدوائی کی پیدائش یکم جنوری 1932 کو اتر پردیش کے معروف شہر بارہ بنکی کے ایک مہذب اور باوقار خانوادے میں ہوئی۔ انہوں نے تعلیم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں حاصل کی۔ ان کی شخصیت میں اودھی تہذیب رچی بسی تھی۔ وہ اعلیٰ انسانی اور اخلاقی اقدار کی حامل تھیں۔ انہوں نے اپنا سیاسی کریئر آنجہانی وزیر اعظم اندرا گاندھی کے ساتھ شروع کیا تھا۔ اندرا گاندھی کے دور اقتدار میں محسنہ قدوائی کو مرکزی وزیر بھی بنایا گیا۔ بعد میں راجیو گاندھی نے بھی ان کو کابینہ میں شامل کیا۔ محسنہ قدوائی گاندھی خاندان کی تین نسلوں کے ساتھ تھیں اور ناقابل فراموش خدمات انجام دیں۔

محسنہ قدوائی کانگریس کی تاحیات وفادار تھیں۔ ان کی شادی 1953 میں خلیل قدوائی سے ہوئی تھی۔ وہ 1977 سے 1989 تک میرٹھ سے لوک سبھا کی رکن رہیں۔ 2004 سے 2016 تک وہ راجیہ سبھا کی رکن تھیں۔ وہ مرکزی حج کمیٹی کی چیئرپرسن بھی رہیں۔ 2022 میں محسنہ قدوائی کی سوانح حیات "My Life in Indian Politics" انگریزی کے ساتھ اردو اور ہندی میں بھی شائع ہوئی تھی۔ اس کے مرتب معروف انگریزی صحافی رشید قدوائی تھے۔ واضح ہو کہ رشید قدوائی کے نانا علامہ عبدالماجد دریابادی تھے جن کا شمار قرآن مجید کے انگریزی اور اردو مفسرین میں ہوتا ہے۔ وہ اردو زبان وادب کے عظیم انشا پرداز تھے۔

(مرحومہ) محسنہ قدوائی کی تدفین حضرت نظام الدین کے قبرستان میں ہوئی جہاں دیگر کانگریسی قائدین کے علاوہ راہل گاندھی اور عمران پرتاپ گڑھی بھی موجود تھے۔ اللہ تعالیٰ مرحومہ کی مغفرت فرمائے۔ آمین! ♦♦ (محمد عارف اقبال)

محترمہ ثمینہ سیّد (شاعرہ، افسانہ نگار)

اردو زبان کی منفرد شاعرہ اور معروف افسانہ نگار محترمہ ثمینہ سیّد کا منگل 17 مارچ 2026 کو لاہور میں انتقال ہوگیا۔ وہ 2023 سے سرطان (Cancer) جیسے موذی مرض میں مبتلا تھیں۔ ان کی عمر تقریباً 53 سال تھی۔

ثمینہ سیّد کی پیدائش 10 مارچ 1973 کو پاک پتن (پنجاب) میں ہوئی۔ گرلز کالج پاک پتن سے ہی انہوں نے ایف ایس سی کیا۔ ان کی شادی کم عمری میں ہوگئی تھی۔ چند سال کے بعد اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ بی اے اور بی ایڈ کے بعد محکمہ تعلیم میں ان کو ملازمت مل گئی۔ اس کے بعد انہوں نے ہسٹری اور اردو میں ایم اے کی ڈگریاں حاصل کیں۔ ایم ایڈ بھی کیا۔ ادب میں ثمینہ سیّد کا معتبر حوالہ کہانی لکھنا اور شاعری کرنا تھا۔ نویں جماعت ہی سے وہ نظم لکھتی تھیں اور پہلا افسانہ 'ایک دکھ نرالا' لکھا تھا۔

ثمینہ سیّد 2007 میں لاہور منتقل ہوگئی تھیں۔ 2008 سے ادبی حلقوں میں ان کی شناخت قائم ہونے لگی۔ ریڈیو کے لیے ڈرامے بھی لکھے اور افسانے ریکارڈ کرائے۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ 'ردائے محبت' 2011 میں شائع ہوا۔ دوسرا مجموعہ 'کہانی سفر میں' 2016 میں منظر عام پر آیا۔ ان کی دیگر تخلیقات میں 'رات نوں ڈکو' (پنجابی کہانیاں)، 'زن زندگی' (افسانوی مجموعہ)، 'ہجر کے بہاؤ میں' (شعری مجموعہ)، 'سامنے مات ہے' (شعری مجموعہ) شامل ہیں۔ ان کے مضامین کا ایک مجموعہ 2025 میں شائع ہوا تھا۔ ان کی تخلیقات ڈائجسٹ کرن، شعاع، پاکیزہ اور خواتین میں شائع ہوا کرتی تھیں۔

ثمینہ سیّد کی تخلیقات پر اب تک ایم اے اور ایم فل کے سات مقالات لکھے گئے۔ انہوں نے اپنے ایم فل کا مقالہ 'فارمین کرسچین یونیورسٹی اساتذہ کا ادبی سفر' کے عنوان پر لکھا تھا۔ انہوں نے اقبالیات اور دیگر ادبی شخصیات پر بھی مقالہ جات لکھے۔

انتقال سے قبل تک غالباً ان کے پی ایچ ڈی کا سفر جاری تھا کہ داعی اجل کو انہوں نے لبیک کہہ دیا۔ ثمینہ سیّد ایک شریف النفس، مخلص، سادہ مزاج اور انسان دوست خاتون تھیں۔

اللہ تعالیٰ مرحومہ کی مغفرت فرمائے اور غریقِ رحمت کرے۔ آمین! ♦♦

کے ایل نارنگ ساقی (ادیب، محبِّ اردو)

معروف محبِّ اردو اور ادیب کرشن لعل نارنگ ساقی جو اردو دنیا میں کے ایل نارنگ ساقی کے نام سے مشہور تھے، سنیچر 6 جون 2026 کو انتقال کر گئے۔ ان کی عمر تقریباً 90 برس تھی۔ ان کو لودھی روڈ کے شمشان (Cremation Ground) میں اتوار 7 جون کو سپرد آتش کیا گیا۔

کے ایل نارنگ ساقی کی مادری زبان پنجابی تھی لیکن ذریعہ تعلیم اردو۔ ان کی پیدائش 24 اگست 1936 کو سوڑھی نگر، فیروز پور (پنجاب) میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم گورنمنٹ ہائر مڈل اسکول، سودھی نگر میں ہوئی اور میٹرک گورنمنٹ ہائی اسکول، فیروز پور سے پاس کیا۔ ان کو شاعری اور طنز و مزاح سے خاص لگاؤ تھا۔ ان کے گھر کے افراد اگرچہ اردو زبان سے واقف نہیں ہیں لیکن اردو سے ان کی محبت کا منہ بولتا ثبوت ان کی ادب نوازی اور ادبی شخصیات سے ان کا دیرینہ تعلق رہا ہے۔ ان میں ہندو پاک کے ممتاز اور مشہور ادبا و شعرا شامل ہیں۔ اس کا بخوبی اندازہ ان کی کتاب 'مشاہیر کے خطوط: نارنگ ساقی کے نام' (مرتب: ڈاکٹر سیفی سرونجی) سے ہوتا ہے۔ مکتوب نگاروں میں اردو دنیا کے ان معتبر ادیبوں اور نقادوں کے اسماء گرامی بھی شامل ہیں جن سے نارنگ ساقی کے گہرے تعلقات تھے۔ بعض ادبی شخصیات ان کے گھر اور دفتر آتی جاتی رہی ہیں جن میں قتیل شفائی کو نمایاں مقام حاصل رہا۔ مکتوب نگاروں میں پاکستان کے احمد ندیم قاسمی، عطاء الحق قاسمی، گلزار جاوید، اظہر جاوید، مشفق خواجہ، انور سدید، سیّد انیس شاہ جیلانی، حمید اختر، جان کاشمیری، دستگیر شہزاد، ریحانہ روحی، سرفراز تبسم، سلطان رشک کے علاوہ ہندوستان کی تقریباً تمام ہی نامور شخصیات موجود ہیں۔ نارنگ ساقی کو لکھے گئے خطوط جہاں عصری ادبی تاریخ کا پتہ دیتے ہیں وہیں ان کی ہر دل عزیزی، ادبی دوستی اور اردو سے بے پناہ محبت کا اشارہ بھی ملتا ہے۔ نارنگ ساقی کی ہر دل عزیزی کا بڑی حد تک اندازہ ان پر لکھی گئی کتاب 'میخانۂ اردو کا پیر و مغاں نارنگ ساقی' (مرتب: نذیر فتح پوری) سے بھی ہوتا ہے۔

نارنگ ساقی اردو کے ممتاز ادیب کنور مہندر سنگھ بیدی لٹریری ٹرسٹ کے جنرل سکریٹری تھے۔ انہوں نے کنور مہندر سنگھ بیدی پر کئی کتابیں مرتب کیں۔ پروفیسر اختر الواسع نے اپنے تعزیتی پیغام میں کہا کہ نارنگ ساقی کے انتقال سے اہل اردو ایک مربی اور مہربان شخصیت سے محروم ہو گئے ہیں۔ نارنگ ساقی کی چند اہم تصنیفات اس طرح ہیں:

ہمارے کنور صاحب، یادوں کا جشن، کلیات سحر، کلیات اکبر الہ آبادی، ادیبوں کے لطیفے، خوش کلامیاں قلم کاروں کی، ہندوستانی ادب کے معمار: کنور مہندر سنگھ بیدی سحر۔

اردو بک ریویو (شمارہ اکتوبر تا دسمبر 2013) کے کالم 'کتاب زندگی' میں نارنگ ساقی کا مختصر انٹرویو شائع ہوا تھا۔ ان سے جب سوال کیا گیا کہ ''ملک میں اردو کی بنیادی اور حقیقی ترقی کے اہم نکات کیا ہو سکتے ہیں؟'' تو موصوف کا جواب تھا ''اردو اسکول زیادہ سے زیادہ قائم کیے جائیں تا کہ آنے والی نسلیں اردو سے مستفید ہو سکیں۔'' ♦♦

فاروق سیّد (صحافی اور بچّوں کے ادیب)

اُردو کے معروف صحافی اور بچوں کے مشہور جریدے 'گُل بُوٹے' کے مدیر فاروق سیّد منگل 19 مئی 2026 کو ممبئی کے ایک پرائیویٹ ہسپتال میں انتقال کر گئے۔ ان کی عمر تقریباً 58 سال تھی۔

فاروق سیّد 5 ستمبر 1968 کو سولا پور (مہاراشٹر) میں پیدا ہوئے تھے۔ انہوں نے سولا پور ہی کے 'دی پروگریسیو اُردو ہائی اسکول' سے 1984 میں ایس ایس سی کے امتحان میں کامیابی حاصل کی اور پھر ایم اے پانگل اینگلو اُردو جونیئر کالج سے بارہویں جماعت تک پڑھا۔ ایک اطلاع یہ بھی ہے کہ مہاراشٹر کالج (ممبئی) سے انہوں نے گریجویشن بھی کیا تھا۔

فاروق سیّد نے ممبئی کے مشہور 'مکتبہ جامعہ' میں بک سیلر کے طور پر اپنی عملی زندگی شروع کی۔ اہل علم و ادب واقف ہیں کہ ممبئی

کا ' مکتبہ جامعہ ' ابتدا ہی سے شعرا وادبا اور اُردو صحافیوں کا ایک مرکز رہا ہے، سو مکتبہ جامعہ ہی میں ممتاز افسانہ نگار اور صحافی ساجد رشید سے اُن کی ملاقات ہوئی اور پھر فاروق سید روزنامہ اُردو ٹائمز سے منسلک ہو گئے۔ اسی روزنامے سے اُن پر صحافتی زندگی کے سنہرے دَر کھلنا شروع ہوئے۔ فاروق سیّد کا شمار اُن لوگوں میں ہوگا جو نچلی سطح سے چھلانگ لگا کر کسی بلندی پر نہیں پہنچے بلکہ بتدریج انہوں نے جدوجہد کی اور آہستہ آہستہ ترقی کی منازل طے کیں۔ وہ اپنے دَور میں بچوں کے ایک جریدے ' گُل بوٹے ' کے بانی مدیر بن گئے اس طرح فاروق سیّد ایک منتظم اور سماجی درد رکھنے والے معزز تشخص تک پہنچے۔ کسی زمانے میں روزنامہ اُردو ٹائمز (ممبئی) کے بچوں کا صفحہ اُس دَور کے ممتاز شخص ایم اے حجازی مرتب کیا کرتے تھے اور پھر اسی روزنامے کا صفحۂ اطفال ' گُل بوٹے ' فاروق سید نے ایڈٹ کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ بچوں کا یہ صفحہ اُن کی پہچان بنانے میں بنیاد بن گیا۔ وہ جب اُردو ٹائمز سے الگ ہوئے تو انہوں نے ' گل بوٹے ' ہی کے نام سے اپنا جریدہ جاری کیا اور پورے انہماک اور پوری توجہ انہوں نے اس جریدے پر مرکوز کی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ممبئی ہی میں نہیں بلکہ مہاراشٹر سے نکل کر ملک بھر میں ' گل بوٹے ' مشہور ہی نہیں مقبول بھی ہو گیا۔

جیسا کہ اوپر کی سطروں میں لکھا گیا ہے کہ فاروق سید منتظم کے طور پر بھی اپنا ایک تشخص رکھتے تھے، انہوں نے سولا پور میں سہ روزہ ' اُردو میلے ' کا 1999 میں اہتمام کیا، جس میں علی سردار جعفری اور کالیداس گپتا رضا جیسے اپنے وقت میں اُردو کے اکابر نے خصوصی طور پر شرکت کی تھی۔ سولا پور کے مشہور شاعر میر افضل نے فاروق سیّد کو یاد کرتے ہوئے یہ بھی بتایا کہ ہمارے شہر کے اُردو والے اس سہ روزہ اُردو میلے میں اُردو کی جو سرگرمیاں ہوئیں، انہیں فراموش نہیں کر سکتے اور ہمارے لیے یہ اعزاز کی بات ہے کہ فرزندِ سولا پور فاروق سید کی مساعی اس میلے کی اساس بنیں۔ نہایت معمولی سطح سے فاروق سید نے اپنی زندگی کا سفر شروع کیا اور اپنے اخلاق و کردار، لگاتار کوششوں سے ایک بلندی تک پہنچے۔ فاروق سید کو ڈرامے سے بھی شغف تھا اور سولا پور کے معروف ڈرامسٹ اقبال سید کو اسٹیج پر متعارف کرانے میں مرحوم کی کوششیں بھی یاد رکھی جائیں گی۔

فاروق سیّد کے تعلق سے یہ کہنا صداقت پر مبنی ہے کہ انہوں نے اُردو ہی سے اپنا تشخص بنایا تو اُردو ہی کے لیے وہ تاحیات سرگرم ہی نہیں رہے بلکہ ادبِ اطفال جیسے شعبے میں اپنی تمام تر صلاحیتیں لگا دیں، جس کا روشن نتیجہ ان کا جریدہ ' گل بوٹے ' بن گیا۔ وہ گزشتہ رمضان میں عمرے کے لیے حجاز گئے تھے اور مکہ مکرمہ ہی میں ان کی طبیعت خراب ہوئی۔ ممبئی لوٹنے کے بعد طبی معائنے پر یہ کھلا کہ انہیں برین ہیمرج ہوا ہے۔ ممبئی میں اُن کے مضروب دماغ کا علاج بھی کیا گیا اور دِل کی جراحی بھی ہوئی مگر پیچیدگی تھی کہ بڑھتی چلی گئی۔ پیر کی شام کو ان کے مجی اور مشہور شاعر قاسم امام نے بتایا کہ فاروق کی حالت غیر ہوتی جارہی ہے اور انہیں وینٹی لیٹر پر رکھا گیا ہے۔ کسی بھی حساس اور باخبر آدمی کے لیے یہ اطلاع ایک خدشے کا سبب بن جاتی ہے اور وہی ہوا کہ منگل (19 مئی) کو جب مغرب کی اذان ہو رہی ہوگی یا ہو چکی تھی تو اُدھر فاروق سیّد کی زندگی کے گل بوٹے مرجھانے کی خبر آن کی آن ممبئی سے لے کر دوحہ قطر تک عام ہو گئی۔ اناللہ وانا الیہ راجعون!

کچھ لوگ لمبی عمر جیتے ہیں اور بعض ایسے ہوتے ہیں کہ عمر تو اُن کی طویل نہیں ہوتی مگر انہیں عمر کے نام پر جو مہلت ملتی ہے، وہ اپنی جستجو اور جہدِ مسلسل سے اسے زندگی بنا دیتے ہیں۔ فاروق سیّد انہی اشخاص میں شمار کیے جا سکتے ہیں۔

فاروق سید کے بارے میں مشہور محقق اور شاعر و ادیب کالیداس گپتا رضا کا یہ جملہ کسی سَند سے کم نہیں:

'' مَیں نے بابائے اُردو مولوی عبد الحق کو تو نہیں دیکھا۔ لیکن اُردو کے ایک فرزند (فاروق سیّد) کو دیکھ رہا ہوں۔ ''

فاروق سید کا کسی سے لڑنا، ناممکن تھا مگر قضا و قدر کی بھی کیسی کیسی صورتیں ہوتی ہیں، گزشتہ دنوں جب ممبئی میونسپل کارپوریشن کا الیکشن ہوا تو فاروق کے دل میں نہ جانے کیا سمائی کہ وہ الیکشن کے اکھاڑے میں کود پڑے۔ جو شخص کسی سے تیز آواز میں بات تک نہ کرنا نہ جانتا ہو وہ دورِ حاضر کی سیاست کے اکھاڑے میں کیسے ٹِک سکتا تھا، لہٰذا فاروق الیکشن ہار گئے مگر اپنے اخلاق اور حسنِ کردار سے انہوں نے جو محاذ جیتے ہیں وہ اظہر من الشمس

ہیں۔ فاروق سید جیسے لوگ ہر زمانے میں اپنی قسمت آزمانے ممبئی جیسے شہر میں آتے رہے ہیں، فاروق دیر سے آئے، ان سے پہلے آنے والے لوگ انہیں دیکھ رہے تھے کہ دیکھتے ہی دیکھتے وہ اپنے پیش رؤوں سے آگے نکل گئے۔ اللہ جس کا اقبال بلند کر دے مگر وہ سب کو تو مقبول نہیں کرتا، اس کی عطا و کرم کے پیمانوں کے اصول وہی جانتا ہے۔

بدھ 20 مئی کو بعد نمازِ ظہر ممبئی کے ناریل واڑی قبرستان میں فاروق سیّد کے جسدِ خاکی کو جب سپرد لحد کیا جارہا تھا تو اُردو کے تمام حلقوں کے نمائندہ افراد و اشخاص کی کثیر تعداد موجود تھی، جن میں سے بعض مالیگاؤں سے تو بعض سولاپور سے بھی 'صاحبِ گُل بوٹے' کو مٹّی دینے کے لیے آئے تھے اور سب کی زبان اُن کے حق میں مغفرت کی دُعا کر رہی تھی۔ فاروق سید کے پسماندگان میں بیوہ کے ساتھ ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہے۔ ◆◆

(تحریر: سینئر صحافی، ادیب و شاعر ندیم صدیقی، ممبئی)

امیر اللہ عنبر خلیقی (بزرگ شاعر)

اردو کے بزرگ شاعر اور معروف سِول انجینئر امیر اللہ عنبر خلیقی نے 96 برس کی عمر میں پیر 27 اپریل 2026 کو داعی اجل کو لبیک کہا۔ مرحوم امیر اللہ عنبر نہایت مخلص، ملنسار، منکسر المزاج اور باغ و بہار طبیعت کے مالک تھے۔ وہ بیدار مغز اور دردمند دل رکھتے تھے۔ ان کا طریق نرم دم گفتگو گرم دم جستجو تھا۔ پیرانہ سالی میں بھی وہ گیسوئے ادب سنوارنے پر کمر بستہ رہتے۔ عنبر صاحب فکر شعر کو محض وقت گزاری کا مشغلہ نہیں سمجھتے تھے بلکہ اس کام کو بھی عبادت سمجھ کر کرتے تھے۔ ان کی شاعری ملمع سازی اور بناوٹ سے پاک تھی۔ وہ ادب کے حوالے سے زندگی کی ترجمانی و تنقید کرتے تھے۔ ان کی شاعری سے قوم و ملت کو فکر و عمل کی تحریک ملتی تھی۔

عنبر خلیقی صاحب زود گو شاعر تھے۔ اردو شاعری کی تقریباً تمام اصناف پر دسترس رکھتے تھے۔ انہوں نے شاعری میں نئے تجربات بھی کیے۔ ان کے چار مجموعے کلام منصۂ شہود پر آچکے ہیں: احساس کا سفر، تلقینِ مسلسل، بازگشت، اور 'ارتقائے سخن'۔ آخری مجموعہ کا نام عجائبات شاعری بھی ہے۔

عنبر خلیقی صاحب ہندی زبان میں بھی شعر کہتے تھے اور ہندی جگت میں بھی مقبول رہے۔ ہندی کے کئی شعرا ان کے آگے زانوئے ادب تہہ کرتے تھے۔ اردو میں بھی کئی شعرا ان سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ عنبر خلیقی پیشے سے سول انجینئر اور آرکیٹیکٹ تھے۔ وہ مساجد اور مدارس کی تعمیرات خلوص اور خدمت کی بنیاد پر کرتے تھے۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت کرے اور جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین! ◆◆ (مرسلہ: ڈاکٹر محمد اظہر حیات، ناگپور)

Mobile: 9823704714

ببّن خاں (دکنی تھیٹر کے معروف ڈرامہ نگار)

عالمی شہرت یافتہ اور گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں جگہ پانے والے ڈرامہ 'ادرک کے پنجے' کے تخلیق کار مشہور ڈرامہ نگار اور اداکار ببّن خاں جمعہ 17 اپریل 2026 کی رات 8 بجے حیدرآباد کے ایک نجی ہسپتال میں انتقال کر گئے۔ وہ گزشتہ ایک ہفتے سے آئی سی یو میں زیر علاج تھے۔ پس ماندگان میں اہلیہ اور دو بچے شامل ہیں۔ ان کی تدفین ہفتہ کی دوپہر شانتی نگر کے قبرستان میں ہوئی۔ ببن خان کا نام 'ادرک کے پنجے' سے جدا نہیں کیا جا سکتا، یہ وہ ڈرامہ ہے جس کے ذریعہ حیدرآباد کے تھیٹر کے ایک دور کو بیان کیا جا سکتا ہے۔ 22 ستمبر 1965 کو پہلی بار پیش کیے جانے والے اس ڈرامے کا آخری شو 11 فروری 2001 کو ہوا تھا۔ مجموعی طور پر ہندوستان کے 64 شہروں اور دنیا کے 18 ملکوں میں اس ڈرامے کے 10 ہزار 180 شو ہوئے اور یہ دنیا کے طویل ترین ون مین شوز میں شامل ہو گیا۔ 5 ہزار 35 شو مکمل ہونے پر اسے 1984 میں گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں شامل کیا گیا۔ اس ڈرامے کی مقبولیت کی وجہ اس کا سادہ مگر طاقتور موضوع اور دکنی لب و لہجہ تھا۔ اس میں ایک عام آدمی کی جدوجہد اور تلخ حقیقتوں کو مزاحیہ انداز میں پیش کیا گیا ہے جو بڑے خاندان اور روزمرہ زندگی کے مسائل کے درمیان گزارا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ طنز و مزاح اور سماجی حقیقتوں سے جڑے اس ڈرامہ نے ہر نسل کے ناظرین میں مقبولیت حاصل کی۔ حیدرآباد کے بعد جن ممالک میں اس ڈرامہ نے شہرت کے جھنڈے

نصب کیے ان میں لندن، فرانس، اسپین، ہانگ کانگ، ٹوکیو، مصر، یونان، روس اور امریکہ شامل ہیں۔

ببّن خاں 22 ستمبر 1944 کو حیدرآباد (دکن) میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق حیدرآباد کے ایک غریب خاندان سے تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جب 22 ستمبر 1965 کو 'ادرک کے پنجے' کا پہلا شو رویندر بھارتی تھیٹر میں ہوا تھا تو ببّن خاں نے 200 روپے تھیٹر کا کرایہ ادا کرنے کے لیے اپنی والدہ محترمہ کے ایک سونے کے زیور کو 275 روپے میں فروخت کرنا پڑا تھا۔ 'ادرک کے پنجے' ڈرامہ تقریباً 60 سے زائد ممالک میں اسٹیج کیا گیا۔ تین دہائیوں تک اس ڈرامہ کے 5169 شوز (Performances) اسٹیج کیے جاتے رہے۔ حیدرآباد کے مکرم نیاز صاحب کے مطابق اس شہرہ آفاق مقبول اور مقبول عام ڈرامے 'ادرک کے پنجے' کی ویڈیو یا آڈیو ریکارڈنگ انٹرنیٹ پر کہیں موجود نہیں ہے۔ البتہ بیسویں صدی کی آخری دہائی میں یہ مکمل ڈرامہ دو عدد آڈیو کیسٹ میں خلیجی ممالک میں دستیاب رہا تھا۔ اس کی خاص وجہ شاید یہ رہی ہے کہ دنیا کی 27 زبانوں میں اپنا ون مین شو (One man show) پیش کرنے والے ببّن خاں سوشل میڈیا سے دور رہے ہیں۔

مکرم نیاز لکھتے ہیں:

''آج سے تقریباً 56 سال قبل پرانے شہر حیدرآباد کے علاقہ آغاپورہ کی اسٹریٹ لیمپ کے نیچے بیٹھ کر 'ادرک کے پنجے' کی ڈھائی گھنٹے کی اسکرپٹ لکھ کر پھر اسے دنیا کے کونے کونے میں دس ہزار شوز کے ذریعے پہنچانے والے ببّن خاں کو ہزاروں سلام!''

اللہ مغفرت فرمائے، عجب آزاد مرد تھا۔ ◆◆

(محمد عارف اقبال)

آصف صفوی (شاعر)

معروف شاعر آصف صفوی کا بدھ یکم اپریل 2026 کو برین ہیمریج کے نتیجے میں انتقال ہو گیا۔ ان کی عمر تقریباً 59 برس تھی۔

اتر پردیش کی صنعتی راجدھانی کانپور کسی وقت اپنے شعرا و ادبا اور صحافتی کردار رکھنے والے اعلیٰ ترین اشخاص سے بھی اپنی ایک شہرت اور وقار و اعتبار رکھتا تھا، پھر اس کے بعد کانپور پر علم و ادب کے سحاب بھی چھائے رہے۔

2004 میں جب ہم کانپور گئے تو شعیب نظام صاحب نے وہاں اسلم محمود، مصطفیٰ فراز ہی سے نہیں بلکہ جاوید ساحل کے مکان پر آصف صفوی سے بھی ملوایا۔ آصف صفوی کا یہ شعر سُن کر تادیر ہم اُن کی طرف دیکھتے رہے:

کئی ہاتھ تجھ کو اُٹھائے ہیں، تجھے میر شہر بنائے ہیں
ترا فن نہیں ہے کمال کا، ترے مہرباں ہیں کمال کے

کانپور لکھنؤ سے کم و بیش دو گھنٹے کی مسافت پر ہے، ثاقب کانپوری، نشور واحدی، کوثر جائسی، شارق ایرایانی، فنا نظامی، ابوالحسنات حقی، قیوم ناشاد، زبیر شفائی، محمد احمد رمزؔ اور زیب غوری جیسے شاعروں کا یہ شہر عصر جدید کے شعر گو شعیب نظام، اسلم محمود، مصطفیٰ فراز، سمیع فراز، فاروق جائسی اور اختر کانپوری جیسے کئی فنکاروں کے سبب آج بھی ویسا ہی نغمہ ریز ہے جیسا کہ نشور واحدی اور فنا نظامی کے دَور میں تھا۔ البتہ لَے ضرور بدلی ہے اور بدلنی بھی چاہیے، ظاہر ہے کہ اب زندگی کی ہر قدر تغیر پذیر ہے۔ شعر و ادب کے رویے بھی تبدیل ہوئے ہیں۔ زندگی ویسی نہیں رہی جیسی کوثر جائسی اور شارق ایرایانی وغیرہ کے دور میں تھی۔ لیکن گنگا کنارے بسے ہوئے اس تاریخی شہر کی بھاگتی دوڑتی ہوئی حیات میں خوشی کی بات ہے کہ شعر و ادب ماند نہیں پڑا۔

1960 کا زمانہ رہا ہوگا جب 'کے سا' (KESA) کانپور الیکٹرک سپلائی اتھارٹی کے زیر اہتمام ریل کی پٹری سے قریب ہونے والے مشاعرے میں قیوم ناشاد سے یہ شعر سنا تھا:

بانسری میں ہم نے اِک ریشم کی ڈوری باندھ لی
تاکہ لہراتے ہوئے آنچل کی یاد آتی رہے

ناشاد صاحب کا شعری آنچل اب تک لہرا رہا ہے۔ مصطفائی پریس (محلہ: بانس منڈی) میں کتابت کرتے ہوئے اسی زمانے میں، قیوم ناشاد فیض آبادی ہی نے کہا تھا:

تلخ ہے کتنا سُکھ سے جینا پوچھ نہ یہ فنکاروں سے
ہم سب لوہا کاٹ رہے ہیں کاغذ کی تلواروں سے

چمن گنج کے جبلی گرلس کالج کے باہر ایک مشاعرے میں نشور واحدی زندہ آدمی کی طرح نہیں بلکہ جیسے اسٹیچو کے سامنے

مائیک لگا دیا گیا تھا مگر وہ اسٹیچو نوحہ خواں تھا:

یہ اشک ندامت جو آئے ہوئے ہیں
فرشتے یہاں سر جھکائے ہوئے ہیں
شریکِ غم و درد کوئی نہیں ہے
خود اپنا جنازہ اُٹھائے ہوئے ہیں

****

شب غم مِری شبِ غم سرِ شام لوٹ آنا
نہ کہیں ترا ٹھکانہ نہ کہیں مِرا ٹھکانہ

اور اپنے مخصوص لحن میں نشور صاحب نے جب یہ شعر پڑھا:

کوئی آج تک نہ سمجھا کہ شباب ہے تو کیا ہے
یہی عمر جاگنے کی، یہی نیند کا زمانہ

تو پورا مجمع جیسے خواب سے بیدار ہو کر شور داد بن گیا تھا۔

آدھی صدی سے زاید پرانی ساعتیں آصف صفوی کی موت نے تازہ کر دیں۔

آصف صفوی 20 فروری 1967 کو پیدا ہوئے تھے اور یکم اپریل 2026 کو وہ رخصت ہو گئے، 59 برس جانے کی عمر دُنیا سے جانے کی تو نہیں ہوتی مگر منشائے الٰہی کے سامنے کوئی نہ زبان کھول سکتا ہے اور نہ ہی ٹھہر سکتا ہے۔ جاوید ساحل کی زبانی معلوم ہوا کہ اُن کے نجی حالات نے اُن کے دل و دماغ کو متزلزل کر رکھا تھا عجب نہیں کہ اسی تشنج ذہنی نے ان کے دن گن کر رکھ دِیے ہوں۔ اناللہ وانا الیہ راجعون!

آصف صفوی کا شعری مجموعہ 'بابِ ہنر' زیورِ طباعت سے آراستہ ہو چکا ہے مگر اُن کے نام اور کلام سے ہم بے خبر تھے۔

کانپور کے عیدگاہ قبرستان میں آصف صفوی کا جسدِ خاکی تو لحد میں اُتار دِیا گیا مگر ان کے شعری پیکر دلوں کو اپنی تاثیر و تاثر سے جگمگاتے رہیں گے:

ناگاہ ٹھہر گئی ہیں موجیں
کیا دریا اُتار چاہتا ہے

****

مِرے سوا بھی کوئی اور مجھ میں ہے موجود
مَیں چپ رہوں تو بہت شور کرنے لگتا ہے

◆◆

(ممبئی کے سینئر صحافی، ادیب و شاعر جناب ندیم صدیقی کی طویل تحریر کی تلخیص)

شبیر احمد انصاری (ملّی خدمت گار)

مسلمانوں کے حقوق اور عدل و انصاف کے لیے ہمہ وقت سرگرم رہنے والے معروف سماجی، سیاسی و ملّی خدمت گار شبیر احمد انصاری طویل علالت کے بعد اتوار 22 مارچ 2026 کو جالنہ میں انتقال کر گئے۔ ان کی عمر تقریباً 78 برس تھی۔ مسلم او بی سی اور دیگر پس ماندہ طبقات کو ان کے حقوق دلانے کے لیے ان کو خاص طور پر یاد کیا جاتا ہے۔ آل انڈیا او بی سی آرگنائزیشن کے قائد اور مسلمانوں کے تعلیمی، سماجی اور ملّی مسائل کے حل کے لیے ان کی آواز بننے والے شبیر انصاری گزشتہ کئی برسوں سے کینسر سے متاثر تھے۔

شبیر احمد انصاری مہاراشٹر کے ضلع پربھنی کے پاتھری گاؤں میں 1949 میں پیدا ہوئے۔ ان کا آبائی پیشہ کپڑا بننے کا تھا۔ ان کا گھرانہ بے حد غریب تھا۔ اس لیے ان کے والد پربھنی سے جالنہ منتقل ہو گئے۔ اس وقت جالنہ اورنگ آباد (مہاراشٹر) ضلع کا تعلقہ تھا۔ غربت کے سبب وہ دسویں بورڈ تک کی تعلیم حاصل کر سکے۔ ریاضی میں ان کو صد فی صد نمبر ملا تھا اور فرسٹ کلاس سے کامیاب ہوئے تھے۔ بعد میں انہوں نے کسی طرح پی یو سی تک کی تعلیم حاصل کی۔ پھر ٹیلرنگ کا کام کرنے لگے اور 'ایکسپرٹ ٹیلر' کے طور پر مقبولیت حاصل کی۔ اس کے ساتھ ہی شبیر احمد انصاری کے روابط ممبئی کے سیاست داں، فلم اداکار اور سماجی کارکنوں سے استوار ہوئے۔

شبیر احمد انصاری کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کے پس ماندہ طبقات کو او بی سی سرٹیفکیٹ اور ریزرویشن کے ذریعے اس طبقات میں مثبت تبدیلی کے لیے جدوجہد کا آغاز کیا۔ انہوں نے اس راہ میں مشکلات کا سامنا کیا لیکن اپنے نصب العین سے انحراف نہ کیا۔ بالآخر ان کو کامیابی ملی۔ شبیر احمد انصاری کی جدوجہد کی داستان ان کی کتاب 'منڈل نامہ' میں تفصیل سے ملتی ہے۔ یہ کتاب مراٹھی میں لکھی گئی تھی جس کے مرتب دلیپ واگھمارے ہیں۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ ممبئی کے ملک اکبر نے کیا ہے جو 2024 میں شائع ہوئی۔ شبیر انصاری کا کہنا تھا کہ آل انڈیا مسلم او بی سی آرگنائزیشن کا نصب

العین آئین کی حفاظت اور ذات پر مبنی مردم شماری ہے۔ اس آرگنائزیشن کے تحت 1994 سے 2004 تک درجنوں احتجاجی پروگرام منعقد کیے گئے۔ ان کی اس تنظیم کو مہاراشٹر کے مختلف اضلاع کے علاوہ دہلی اور لکھنؤ کے سرکردہ افراد کی بھی حمایت حاصل تھی۔ شبیر انصاری جناردن پاٹل اور کپل پاٹل کے ہمیشہ ممنون رہے، جن کی وجہ سے مسلم او بی سی تنظیم وجود میں آئی تھی۔ او بی سی کی اس مہم میں شبیر انصاری سپر اسٹار دلیپ کمار کو بھی جوڑنے میں کامیاب ہوئے تھے۔

شبیر انصاری کے پس ماندگان میں اہلیہ کے علاوہ چھ بیٹیاں اور تین بیٹے شامل ہیں۔ غفران انصاری ان کی اولاد میں سب سے چھوٹے ہیں جو آل انڈیا مسلم او بی سی آرگنائزیشن سے منسلک ہیں۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرما کر ان کی نیکیوں کو شرف قبولیت عطا فرمائے۔ آمین! ♦♦ (محمد عارف اقبال)

اسحاق اثر (صحافی، سماجی کارکن)

پٹنہ کے روزنامہ 'پیاری اردو' کے مدیر اسحاق اثر کا اتوار 17 مئی 2026 کو اچانک حرکت قلب بند ہونے کے سبب انتقال ہو گیا۔ ان کی عمر تقریباً 65 برس تھی۔ وہ اردو ایکشن کمیٹی کے ایک مخلص رکن تھے۔

اسحاق اثر کا تعلق جماعت اسلامی سے بھی تھا۔ وہ جماعت اسلامی پھلواری شریف پٹنہ کے فعال کارکن تھے۔ پابندی سے جماعت کے تمام اجتماعات میں شرکت کرتے تھے۔ جماعت کے سماجی کاموں میں وہ ذمہ داری کے ساتھ حصہ لیتے تھے۔ کوچنگ سنٹر، فری ڈسپنسری کا انتظام و انصرام، اخبارات میں رپورٹ شائع کرنا وغیرہ امور میں فعال کردار ادا کرتے تھے۔ جس دن ان کا انتقال ہوا، اُس دن جماعت اسلامی ہند (پٹنہ ویسٹ) کے تربیتی اجتماع میں وہ شریک تھے۔ ان کے ذمہ ایک کتاب کا مطالعہ پیش کرنا تھا۔ جماعت اسلامی کے ایک اہم رہنما جناب اقبال ملّا کی کتاب 'اسلام کی امتیازی خصوصیات' کا حاصل مطالعہ پیش کر کے ڈائس سے نیچے اترے، کرسی پر بیٹھے اور کوما میں چلے گئے۔ آواز بھی بند ہو گئی۔ پٹنہ ایمس لے جایا گیا لیکن وہ داعی اجل کو لبیک کہہ چکے تھے۔ اسحاق اثر تحریک کے نہایت مخلص کارکن تھے۔ تحریر و تقریر، درس و تذکیر کے ساتھ انتظامی امور میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔

اسحاق اثر پلس ٹو ہائی سیکنڈری اسکول پلنگا میں اردو کے ٹیچر تھے۔ 2020 میں سبکدوش ہوئے تھے۔ اپنے اسکول میں بھی ان کی شخصیت بے حد مقبول تھی۔ اجیت بھوشن جی جو اسی اسکول میں ٹیچر ہیں، ان کے مطابق اسکول میں کوئی پروگرام اسحاق اثر کے بغیر مکمل نہیں ہوتا تھا۔ اسحاق اثر اگرچہ اردو ٹیچر تھے لیکن ضرورتاً وہ ہندی اور انگریزی کے کلاسیز کو بھی پڑھاتے تھے۔

جماعت اسلامی ہند، حلقہ بہار کے صدر رضوان احمد اصلاحی نے اپنے تاثراتی مضمون (روزنامہ پندار، پٹنہ 20 مئی 2026) کے آخر میں لکھتے ہیں ''اچانک انتقال سے یقیناً حیرت ہوتی ہے، لیکن موت کا مسنون وقت آچکا تھا... معروف عالم دین اور ملی رہنما جناب مفتی ثناء الہدیٰ نے نماز جنازہ پڑھائی اور حاجی حرمین قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ ... اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین! ♦♦

ڈاکٹر سیّد محمد حامد (محبِّ اردو اور سماجی کارکن)

اردو کی ممتاز ادیبہ اور 'فکر و آگہی' کی مدیرہ ڈاکٹر رضیہ حامد کے شوہر ڈاکٹر ایس ایم حامد (سیّد محمد حامد) کا اتوار 22 فروری 2026 کی شب بھوپال میں انتقال ہو گیا۔ ان کی تدفین 23 فروری کی صبح عمل میں آئی۔ وہ تقریباً 85 برس کے تھے۔ پس ماندگان میں اہلیہ کے علاوہ تین بیٹے (ڈاکٹر محمد عاصم، سیّد محمد عاطف، سیّد محمد عامر) اور ایک بیٹی (صالحہ) شامل ہیں۔ ڈاکٹر حامد مختلف عوارض کے سبب طویل عرصے سے صاحب فراش تھے۔ ان کا وطنی تعلق مجاہد ملت (مولانا) حفظ الرحمن سیوہاروی کی سرزمین سیوہارہ سے تھا۔

سیّد محمد حامد نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد بی ایچ ای ایل (BHEL) سے اپنا کریئر شروع کیا تھا۔ وہ کافی عرصے نوئیڈا (دہلی این سی آر) میں واقع بی ایچ ای ایل کے ہیڈ کوارٹر سے وابستہ رہے اور تین دہائیوں تک خدمات انجام دے کر وظیفہ حسن خدمت پر ریٹائرڈ

ہوئے تھے۔ سبکدوشی کے بعد بھوپال واپس چلے گئے۔ نوئیڈا میں قیام کے دوران وہ اپنی اہلیہ کے ساتھ دہلی کی علمی و ادبی محفلوں میں پابندی سے شریک ہوتے تھے۔ وہ نہایت وضع دار، بااخلاق اور منکسرالمزاج انسان تھے۔ مرحوم اردو زبان سے قلبی لگاؤ رکھتے تھے اور اردو کی ادبی نشستوں میں شرکت کرنا پسند کرتے تھے۔ مرحوم کی نماز جنازہ بھوپال کے باب عالی کے پاس واقع قدیمی مسجد میں ادا کی گئی۔ تدفین بڑا باغ قبرستان (نزد سیفیہ کالج، بھوپال) میں عمل میں آئی۔

اللہ رب العزت مرحوم کی مغفرت فرمائے۔ ان کی نیکیوں کو شرف قبولیت عطا فرما کر جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ ڈاکٹر رضیہ حامد اور ان سے وابستہ تمام افراد کو اللہ تعالیٰ صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین! ♦♦ (محمد عارف اقبال)

ڈاکٹر محمد نصیر الدین ناصر عمری

(شاعر، طبیب معلم)

شاعر، طبیب، معلم اور فکر اسلامی کے علمبردار ڈاکٹر محمد نصیر الدین ناصر عمری ولد محمد حاتم (مرحوم) کا منگل 7 اپریل 2026 کو رانچی کے ایک ہسپتال میں انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر تقریباً 70 برس تھی۔ ان کی تدفین دوسرے دن بدھ کو ان کے آبائی گاؤں دیگھاری، ضلع جام تاڑا (جھارکھنڈ) میں ہوئی۔ پس ماندگان میں والدہ اور اہلیہ کے علاوہ تین بیٹیاں اور چار بیٹے شامل ہیں۔

ڈاکٹر محمد نصیر الدین 29 اکتوبر 1955 کو صوبہ بہار کے ضلع دُمکا موضع دیگھاری (اب جھارکھنڈ ضلع جام تاڑا) میں پیدا ہوئے۔ ان کی ثانوی تعلیم مدرسہ فیض عام مئو میں ہوئی۔ جامعہ دارالسلام عمرآباد (تمل ناڈو) سے 1974 میں فضیلت کی تکمیل کی۔ ان کے اساتذہ میں سیّد امین، حفیظ الرحمن اور (مولانا) ابوالبیان حماد شامل تھے۔ ادارہ تصنیف علی گڑھ میں (مولانا) جلال الدین عمری کی نگرانی میں تصنیفی تربیت حاصل کرنے کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طبیہ کالج میں داخلہ لیا۔ تعلیم کے دوران ٹیوشن پڑھا کر اپنے اخراجات پورے کرتے تھے۔ وہ طلبا تنظیم اسٹوڈنٹس اسلامک موومنٹ سے بھی وابستہ رہے جس کا قیام علی گڑھ میں 25 اپریل 1977 کو عمل میں آیا تھا۔ 1980 میں BUMS کی تکمیل کے بعد انہوں نے طب وحکمت کو ذریعہ معاش بنایا۔ ساتھ ہی دین اسلامی اور سماجی کاموں کو انجام دیتے تھے۔

ڈاکٹر محمد نصیر الدین عمری شاعر بھی تھے۔ انہوں نے اکتوبر 1979 میں ناگپور میں منعقد ہونے والی دوسری کل ہند کانفرنس کے دوران میں مشاعرے میں شرکت بھی کی تھی اور اپنا کلام بھی سنایا تھا۔ اس مشاعرے میں حفیظ میرٹھی اور میم نسیم کے علاوہ ادارہ ادب اسلامی سے وابستہ شعرا و ادیب ابوالمجاہد زاہد، کیف نوگانوی، ابوالبیان حماد، ڈاکٹر عبدالباری شبنم سبحانی، پروفیسر منشاء الرحمٰن منشا اور شمس الدین حامد وغیرہ شامل تھے۔ مشاعرے کی صدارت جناب حفیظ میرٹھی (مرحوم) نے کی تھی۔

ڈاکٹر نصیر الدین عمری نے اکتوبر 2005 میں 'ابوالکلام آزاد ایجوکیشن اینڈ ویلفیئر سوسائٹی' جام تاڑا میں قائم کی تھی جس کے وہ جنرل سکریٹری تھے۔ اس ادارے کی جانب سے ایک دینی، اصلاحی رسالہ 'رخت سفر' بھی جاری کیا تھا۔ ان کی شخصیت کا ایک دلکش پہلو ان کی خوش الحانی تھی۔ وہ ترنم کے ساتھ نظم یا نعت وغیرہ کی قرأت کرتے تھے۔ انگریزی زبان اچھی طرح، روانی سے بولتے تھے۔ شعر و شاعری کے فن پر بھی دسترس تھی۔ انڈین یونین مسلم لیگ کے ضلعی جنرل سکریٹری بھی رہے۔ سماج میں ان کی شخصیت بے حد مقبول تھی۔ ہندی اخبار 'جاگتا جھارکھنڈ' نے ڈاکٹر نصیر الدین کی نماز جنازہ کی تصویر کے ساتھ مفصل رپورٹ شائع کی تھی۔ ان کے چاروں بیٹے ڈاکٹر اور بیٹیاں عالمہ ہیں۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ مرحوم کے فرزند ڈاکٹر ندیم الحق نے بھی اپنے والد کی طرح 2012 میں ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی علی گڑھ میں تصنیفی کورس مکمل کیا تھا۔ منور قاسمی نے منظوم خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا:

مغفرت ہو جائے ربّا کر رہے ہیں ہم دعا
قبر اُن کی ہو منور، ہو گئے ہم سے جدا

(ڈاکٹر نعمان بدر فلاحی کے طویل مضمون سے ماخوذ)

♦♦

محمد احمد (سابق پروف ریڈر قومی آواز، دہلی)

روزنامہ 'قومی آواز' دہلی کے سابق پروف ریڈر محمد احمد کا بدھ 20 مئی 2026 کو انتقال ہو گیا۔ وہ گزشتہ 6 ماہ سے زیر علاج تھے۔ ان کی عمر تقریباً 78 برس تھی۔ ان کی تدفین ملکہ گنج قبرستان، دہلی میں ہوئی۔ لواحقین میں ایک بہن اور دو بھائی شامل ہیں۔

محمد احمد 'قومی آواز' کے شعبہ پروف ریڈنگ سے تقریباً 28 سال وابستہ رہے۔ وہ کشن گنج دہلی کے شیش محل میں رہتے تھے۔ وہیں انہوں نے ایک پبلشنگ ادارہ 'پرنٹ آرٹ' کے نام سے قائم کیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اردو اشاعتی ادارے میں کمپیوٹر DTP عام نہیں ہوا تھا۔ محمد احمد نے اپنے ادارے میں آرٹسٹ اور کاتب کو جگہ دی تھی۔ ان کے آرٹسٹ اور کاتب دیگر بڑے اردو پبلشرز کے لیے بھی کام کرتے تھے۔ ایک معروف اشاعتی ادارہ 'مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی' جب دہلی کے بازار چتلی قبر میں واقع تھا تو 'پرنٹ آرٹ' کے آرٹسٹ نے درجنوں سرورق کے ڈیزائن بنائے۔ ایک کاتب نے کتابت کا کام بھی کیا۔ اسی زمانے میں ایک نوجوان جو دہلی یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھے، مرحوم محمد احمد کے زیر سایہ شیش محل میں رہا کرتے تھے۔ اپنے ادارے میں محمد احمد نے اس نوجوان کے لیے مفت قیام کا انتظام کیا تھا۔ حتیٰ کہ ان کے ابتدائی روزگار کے لیے 'قومی آواز' میں جز وقتی پروف ریڈر کے طور پر کام کرنے کے مواقع بھی مہیا کرائے تھے۔ یہ وہی دور تھا جب حیدرآباد میں 'مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی' کا قیام (1998) عمل میں آیا تھا جس کے پہلے وائس چانسلر پروفیسر شمیم جیراج پوری تھے۔ 'پرنٹ آرٹ' شیش محل کیمپس میں مقیم یہ نوجوان ظفر الدین تھے جنہوں نے دہلی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی تھی اور بعد میں مولانا آزاد نیشنل یونیورسٹی میں پروفیسر شمیم جیراج پوری کی کوشش سے ان کا تقرر ہوا تو وہ پروفیسر ظفر الدین ہوئے۔ لیکن ان کی عمر نے وفا نہیں کی اور اپنی ملازمت کے دوران میں ہی وہ انتقال کر گئے۔

محمد احمد، انتہائی شریف النفس اور سادہ لوح محنتی انسان تھے۔ دوسروں کی مدد کرنے میں ان کو خوشی ہوتی تھی۔ انہوں نے اپنے ادارے سے متعدد دینی کتابیں شائع کیں۔ وہ چھوٹی مسجد اہل حدیث احاطہ کیدار خاں باڑہ ہندوراؤ کے تاعمر متولی رہے۔ مئو کے معروف پبلشنگ ادارہ 'مکتبہ الفہیم' کے مالک عزیز الرحمن ابو اشعر فہیم سے محمد احمد کے خاص دوستانہ مراسم تھے۔ علالت کے دوران بھی وہ عیادت کے لیے متعدد بار آئے۔

اللہ رب العزت مرحوم کی مغفرت فرمائے اور ان کے حسنات کو شرف قبولیت بخشے۔ آمین!◆◆ (محمد عارف اقبال)

چھپتے چھپتے...

بین الاقوامی شہرت یافتہ معروف اسلامی ماہر معاشیات اور نظریہ ساز مفکر ڈاکٹر عمر چھاپرا اِتوار 14 جون 2026 کو سعودی عرب میں انتقال کر گئے۔ ان کی عمر تقریباً 93 سال تھی۔ تفصیلات آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں، اِن شاءاللہ۔ (ادارہ)

اُردو سیکھنے کا نیا طریقہ
Modern Method to Learn Urdu

مصنف: ڈاکٹر سیّد تنویر حسین

ISBN 978-93-83239-98-6

صفحات: 224، قیمت: -/220، اشاعت: 2022

عالمی جنرل نالج (اعداد کی روشنی میں)

مصنف: ڈاکٹر عبدالسمیع صوفی

ISBN 978-93-83239-77-1

صفحات: 416، قیمت: -/300، اشاعت: 2018

تاریخِ انصاریان
(تذکرۂ علما و فضلا خاندانِ انصاریٔ کشمیر)

مصنف: مسرور عباس انصاری

ISBN 978-93-90579-72-3

صفحات: 472 (مجلد)، قیمت: -/500، اشاعت: مئی 2025

رابطہ: اردو بک ریویو، نئی دہلی۔ موبائل: 9953630788

نئی کتب

NEW ARRIVALS
Classified List

تحقیق و ترتیب: محمد عارف اقبال

اسلامیات: قرآنیات، سیرت، احادیث، فقہ

اسمائے کتب	مصنف/مؤلف/مترجم	صفحات	قیمت	ناشر/تقسیم کنندگان
اسلام اور نوجوان ذہن الحادی شبہات...	ڈاکٹر وقاص احمد	472	700/-	حرا بک ڈپو، لکھنؤ۔ Mob: 7007892005
اسلام میں علم کا مقام و مرتبہ (نیا ایڈیشن)	علامہ محمد شہاب الدین ندوی	216	260/-	فرقانیہ اکیڈمی، بنگلور۔ Mob: 7259900813
اظہارِ دین (اسلام کا علمی اور فکری مطالعہ)	مولانا وحید الدین خاں	752	درج نہیں	گڈ ورڈ بکس، نوئیڈا۔ Mob: 8588822672
اکیسویں صدی اور اسلام	علامہ محمد شہاب الدین ندوی	92	120/-	فرقانیہ اکیڈمی، بنگلور۔ Mob: 7259900813
اکیسویں صدی کا جہاد قرآن عظیم کے ذریعہ	علامہ محمد شہاب الدین ندوی	40	50/-	فرقانیہ اکیڈمی، بنگلور۔ Mob: 7259900813
حدیث میں سیّد مودودی کی خدمات	ڈاکٹر محسنہ عظیم	430	290/-	بینات پبلشرز، اورنگ آباد۔ M: 8208309240
رسائل من علی بن ابی طالب (پیام علیؓ)	ادھم شرقاوی/محمد مبشر راشد ندوی	——	300/-	حرا بک ڈپو، لکھنؤ۔ Mob: 7007892005
قرآن کی حجت: عالم انسانی پر	علامہ محمد شہاب الدین ندوی	76	100/-	فرقانیہ اکیڈمی، بنگلور۔ Mob: 7259900813
محدّثین کا طریقہ کار اپنی تصنیفات کے...	محمد خالد ندوی غازی پوری	200	200/-	جمعیۃ المعارف الاسلامیہ، لکھنؤ۔ M: 9984778800

سماجیات: سائنس، سیاست، تعلیم، میڈیا

اسمائے کتب	مصنف/مؤلف/مترجم	صفحات	قیمت	ناشر/تقسیم کنندگان
آؤ جانوروں سے ملیں	عبد الودود انصاری	146	190/-	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی-25
ادویہ مفردہ	NCPUL	463	285/-	NCPUL، نئی دہلی۔ Tel. 011-26109746
اَدھیاتم اور سفل جیون (ہندی)	مولانا وحید الدین خاں	264	درج نہیں	گڈ ورڈ بکس، نوئیڈا۔ Mob: 8588822672
الف سے AI تک	ریحان خان	——	300/-	حرا بک ڈپو، لکھنؤ۔ Mob: 7007892005
امراضِ اطفال	NCPUL	566+13	350/-	NCPUL، نئی دہلی۔ Tel. 011-26109746
حکمتِ اختلاف: ضرورت، اہمیت...	مولانا وحید الدین خاں	280	درج نہیں	گڈ ورڈ بکس، نوئیڈا۔ Mob: 8588822672
شفا کے نئے اُفق (تاریخ ترقیاتِ...)	ڈاکٹر منور احمد کنڈے	336	550/-	EPH، دریا گنج، نئی دہلی۔ Tel. 011-45678286
فن اسماء الرجال اور ہندوستانی علما کی...	خورشید احمد اعظمی مدنی	118	250/-	المکتب العلمی، مئو۔ Mob: 9793118234
کلیاتِ ادویہ	NCPUL	225	160/-	NCPUL، نئی دہلی۔ Tel. 011-26109746
مسلم یونیورسٹی اور 1965	ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی	368	1000/-	دفتر دینی تعلیمی کونسل، لکھنؤ۔ M: 7390026808
مضطرب نسل (The Anxious ...)	جوناتھن ہیڈ/مترجم سیّد عرفان احمد	176	300/-	حرا بک ڈپو، لکھنؤ۔ Mob: 7007892005

ادب: انٹرویوز/آپ بیتی/سفرنامہ/خطوط

اسمائے کتب	مصنف/مؤلف/مترجم	صفحات	قیمت	ناشر/تقسیم کنندگان
ذکر واضح (سوانح سیّد محمد واضح رشید ندوی)	ڈاکٹر محمد اکرم ندوی	96	150/-	حرا بک ڈپو، لکھنؤ۔ Mob: 7007892005
عدالت مرے ضمیر کی: احمد فراز کے انٹرویوز	ابراہیم افسر	390	650/-	علم و ادب فاؤنڈیشن، میرٹھ۔ M: 9897012528

ادب: تحقیق و تنقید/لسانیات/نصابیات

اسمائے کتب	مصنف/مؤلف/مترجم	صفحات	قیمت	ناشر/تقسیم کنندگان
پربھنی ضلع: آزادی سے پہلے اور آزادی...	محمد ضیاء الدین (پربھنی)	552	350/-	ریجنل نیوز، پربھنی۔ Mob: 9822651193
تحریر بے عدیل (طبع مکرر)	قاضی محمد عدیل عباسی/ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی	1600	1400/-	حرا بک ڈپو، لکھنؤ۔ Mob: 7007892005
چلو ٹک میر کو سننے (ہندی)	میر تقی میر/ادارت: وپن گرگ	646	999/-	راج کمل پرکاشن، دریا گنج، نئی دہلی-110002

حرفوں کا جادو (رشید حسن خاں)	مرتب: ڈاکٹر ابراہیم افسر	182	320/-	علم وادب فاؤنڈیشن، میرٹھ۔ M: 9897012528
داستانِ لکھنؤ (سیاسی، علمی اور ادبی تاریخ)	محمد باقر شمس	494	999/-	ریختہ پبلی کیشنز، نوئیڈا۔ contact@rekhta.org
دبستانِ لکھنؤ (لسانی، شعری اور تہذیبی...)	محمد باقر شمس	536	999/-	ریختہ پبلی کیشنز، نوئیڈا۔ contact@rekhta.org
سَیر کے قابل دنیا (کلیات فصیح اکمل)	ڈاکٹر صدف فاطمہ	560	750/-	فلک بک ڈپو، نئی دہلی۔ Mob: 8851148278
شعور کے سائے تلے (مضامین)	ڈاکٹر منور احمد کنڈے	264	350/-	EPH، دریا گنج، نئی دہلی۔ Tel. 011-41418204
شیش محل: شوکت تھانوی	تدوین ومقدمہ: مشتاق اعظمی	224	385/-	ذیشان برادرس/ مکتبہ جامعہ ممبئی۔ M: 9082835669
عصری لغت برائے فنونِ لطیفہ (لسانیات)	روپ نرائن باتھم/ محمد سجاد عثمانی	606	685/-	NCPUL، نئی دہلی۔ Tel. 011-26109746
گوہر ارزاں (مضامین اور تبصرے)	رضوان اللہ آروی	388	500/-	EPH، دریا گنج، نئی دہلی۔ Tel. 011-41418204
مجموعۂ شرِ سرسیّد: 20 جلدیں ایک تعارف	ڈاکٹر عطا خورشید	104	درج نہیں	ایکسٹرا آرڈینری لائف میڈیا، لکھنؤ۔ M: 9839026995
ہم اور دنیا (مضامین)	ڈاکٹر منور احمد کنڈے	204	300/-	EPH، دریا گنج، نئی دہلی۔ Tel. 011-41418204

ادب: افسانے/ ناول/ خاکے/ طنز ومزاح/ انشائیے/ ڈرامے

عنکبوت (ناول)	نورا راجپوت	چار جلدیں	3250/-	حرا بک ڈپو، لکھنؤ۔ Mob: 7007892005
مکمل دنیا کا آدھا آدمی (طنز ومزاح)	محمد اظہر فاضل	150	150/-	مرزا ورلڈ بک ڈپو، اورنگ آباد۔ M: 9422713659

تاریخ وتذکرہ

مختصر تاریخ اسلام مع ضمیمہ ونقشہ جات	غلام رسول مہر	350	500/-	مکتبہ احسان، لکھنؤ۔ Mob: 7007892005
یادِ مہرباں (سیّد جعفر محمد حسنی ندویؒ)	ڈاکٹر محمد اکرم ندوی	184	150/-	حرا بک ڈپو، لکھنؤ۔ Mob: 7007892005

شخصیات

اردو کا مسافر سلطان اختر	مرتب: ش۔ شکیل	112	100/-	ارشد صدیقی، بیڑ۔ Mobile: 8999434891
Two Icons of Islamic West Africa Usman Dan Fodio Umar Tal	ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں	160	350/-	ظفر الاسلام خاں۔ Mobile: 9911142151 فاروس میڈیا اینڈ پبلشنگ پرائیویٹ لمیٹڈ، نئی دہلی-25
ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی: قائد ملت...	مرتب: معصوم مرادآبادی	400	500/-	خبردار پبلی کیشنز، دہلی۔ Mob: 9810780563
سیّد کام کرتا ہے (ڈاکٹر سیّد احمد خاں)	عبدالحی	222	300/-	حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔ M: 8800489404

ادب اطفال

ٹیپو کی کہانیاں	محمد سراج عظیم	48	40/-	رحمانی پبلی کیشن، مالیگاؤں۔ M: 9890801886
کتنے ہندوستان (عام معلومات)	ڈاکٹر بانو سرتاج	64	100/-	اَرسم پبلی کیشنز، نئی دہلی۔ Mob: 9899506816
مستقبل کا پاسپورٹ (AI for Kids)	عامر پٹنی	208	320/-	حرا بک ڈپو، لکھنؤ۔ Mob: 7007892005

شعری ادب

اصواتِ نعت (اردو نعتیہ دیوان)...	پروفیسر محمد طاہر صدیقی	710	5000/-	نعت، پوسٹ بکس نمبر 25، فیصل آباد۔ (پاکستان)
افکار (شعری مجموعہ)	مسعود الحسن عثمانی	500	1000/-	احمد فرید عباسی، سدھارتھ نگر۔ M: 9839582224
درد تیرتے پھول	پرویز مظفر	240	399/-	مظفر حنفی میموریل سوسائٹی، بٹلہ ہاؤس، نئی دہلی-25
زندگی درد سہی (ہندی ایڈیشن)	مسرت دہلوی (پروفیسر چندر بھوشن)	176	500/-	اپلائڈ بکس، نئی دہلی۔ Mob: 9953630788
چراغِ کفِ درویش (غزلیں)	عبدالغنی فیضی	216	600/-	مکتبہ الفہیم، مئوناتھ بھنجن۔ (اتر پردیش)
کاتی ہوئی غزل	ساجد پریمی	234	300/-	42 گنوری گرلس اسکول، بھوپال۔ M: 9713429578
کلیات والی آسی	مرتب: جمال آسی	440	600/-	حرا بک ڈپو، لکھنؤ۔ Mob: 7007892005

نئی روشنی (شعری مجموعہ) عقیل عباس طلب گار 192 -/400 عقیل عباس طلب گار،ممبئی۔M: 9820038704

رسائل و جرائد: خصوصی اشاعت

- آجکل، ماہنامہ (خصوصی گوشہ سیمانچل)، ایڈیٹر: عبدالمنان، صفحات:106 ، سالانہ:-/350 ،مئی 2026، پتہ: پبلی کیشنز ڈویژن، سوچنا بھون، نئی دہلی-110003 فون نمبر:011-24369189
- ادراک گوپال پور، خصوصی اشاریے، مدیر اعزازی: پروفیسر سیّد حسن عباس، صفحات:248 ، قیمت:-/300 ،جنوری تا مارچ 2026، پتہ: مرکز تحقیقات اردو و فارسی، گوپال پور، سیوان۔(بہار) موبائل نمبر:9839337979
- اذکار، سہ ماہی ادبی و تہذیبی مجلہ، ایڈیٹر: محمد علی قاضی/ڈاکٹر بی محمد داؤد محسن، صفحات:340 ، قیمت:-/200 ،جنوری تا مارچ 2026، پتہ: ایس اعجاز پاشا، رجسٹرار کرناٹک اردو اکادمی، تھرڈ فلور، ایس سی روڈ، KMDC بھون، بنگلورو۔(کرناٹک) موبائل نمبر:9449202211
- اردو گلبن، پندرہ روزہ (جدہ) طارق غازی نمبر، تزئین کار: محمد سلیمان طاہر، مدیر منتظم: مہتاب قدر، صفحات: 30 (رنگین)، قیمت: درج نہیں، 16 تا 30 اپریل 2026، رابطہ: واٹس ایپ نمبر:1329193 50 966+ ۔ای میل:mahtabqadr@gmail.com
- اسلام اور عصر جدید (خصوصی شمارہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ کا سفر صد سالہ)، ایڈیٹر: پروفیسر حبیب اللہ خاں، ڈاکٹر محمد مشتاق تجاروی، صفحات:196 ، سالانہ: -/380، اکتوبر 2025، پتہ: ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی-110025
- تجلیاتِ زینت (نکاح نمبر)، ایڈیٹر: ڈاکٹر شفیق اجمل قادری، صفحات:520 ، قیمت:-/1000 ، (سالنامہ) 2025، پتہ: جامعہ زینت الاسلام، B-18/51-C، ریوری تالاب، وارانسی-221001 (اتر پردیش)۔موبائل نمبر:9839655808
- راہ اعتدال، ماہنامہ (خصوصی اشاعت)، ایڈیٹر: محمد رفیع کلوری عمری، صفحات:224 ، قیمت:-/100 ، جون 2026، پتہ: جمعیت ابنائے قدیم جامعہ دارالسلام، عمرآباد-635808 (تمل ناڈو)۔موبائل نمبر:9342801900
- رفیق منزل، ماہنامہ (خصوصی گوشہ: شیعہ سُنّی اتحاد)، ایڈیٹر: صفی الرحمن نبیل، عبدالخالق، صفحات:40 ، سالانہ:-/300 ، جون 2026، پتہ:D-300 ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی-110025۔موبائل نمبر:7042406691
- صلاح کار، ماہنامہ (بچّوں کا ڈائجسٹ)، ایڈیٹر: حامد علی اختر، صفحات:80 ، سالانہ:-/550 ، جون 2026، پتہ:E-54 گراؤنڈ فلور، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی-110025۔موبائل نمبر:9810218638
- المجیب، سہ ماہی (حضرت رسول نما بنارسی نمبر)، ایڈیٹر: ڈاکٹر شاہ فتح اللہ قادری، صفحات:380 ، قیمت:-/400 ، اکتوبر 2025 تا مارچ 2026، پتہ: دارالاشاعت خانقاہ مجیبیہ، پھلواری شریف، پٹنہ-801505 (بہار)۔موبائل نمبر:9942000618
- نعت رنگ (کتابی سلسلہ 34)، ایڈیٹر: سیّد صبیح الدین رحمانی، صفحات:426 ، قیمت:-/1000 ، جون 2026، پتہ: گلستانِ جوہر، B-306 بلاک 14، کراچی۔(پاکستان)۔موبائل نمبر:226 2668 332 92+
- نقوشِ طیبات، بھٹکل (خواتین اسلام کا ترجمان)، ایڈیٹر: محمد ناصر سعید اکرمی، صفحات:52 ، قیمت: درج نہیں، مئی جون 2026، پتہ: معہد امام حسن البنا بھٹکل، مدینہ کالونی، بھٹکل-581320 (کرناٹک)۔موبائل نمبر:9902105300
- فیضانِ ادب، سہ ماہی (مولانا ارشاد حسین نمبر)، ایڈیٹر: ڈاکٹر فیضان احمد، قیمت:-/500 ، اپریل تا ستمبر 2026، پتہ: ادارہ تحقیقات اردو و فارسی، پورہ معروف، کرتھی جعفر پور، مئو-275305 (اتر پردیش)۔موبائل نمبر:7388886628

❑❑❑

سلام و نیاز (مجموعۂ خطوط)

خصوصی رعایت 50%

مصنف: ساحل احمد صفحات: 856 (مجلد) قیمت:-/920

ISBN 978-81-944111-3-0

رابطہ: اردو بک ریویو، نئی دہلی Tel. 011-44753890 / 9953630788

اردو کے ممتاز صحافی اور محقق محمد طارق غازی کے قلم سے

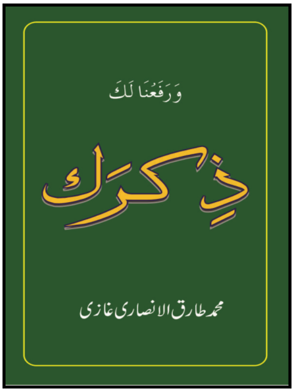

Pages: 744 - Price: Rs. 500/-

سیرت کی کتب میں عموماً واقعات ملتے ہیں لیکن تاریخی تناظر میں ان واقعات کا عمرانی اور سیاسی تجزیہ نہیں ملتا جن کے اثرات مکہ اور مدینہ کی سیاست اور اقتصادیات پر نظر آئے۔ اس اعتبار سے یہ کتاب نہ صرف منفرد ہے بلکہ پہلی بار سیرت کے عمرانی، سیاسی اور اقتصادی اقدامات کا تاریخی تجزیہ کیا گیا ہے۔

سوانح ہاجرہ نازلی

یہ سوانحی واقعات مشہور ادیبہ ہاجرہ نازلی کے ہیں۔ ان کے اٹھارہ ناول اور ستّر اَسّی کے قریب افسانے اور کہانیاں نیز مختلف موضوعات پر مضامین و مکالمے ماہنامہ بانو دہلی، حریم لکھنؤ اور مختلف ڈائجسٹوں میں شائع ہوتے رہے۔ ان سوانحی واقعات کو ان کی بیٹی شہناز کنول غازی (علی گڑھ) نے مرتب کیا ہے۔

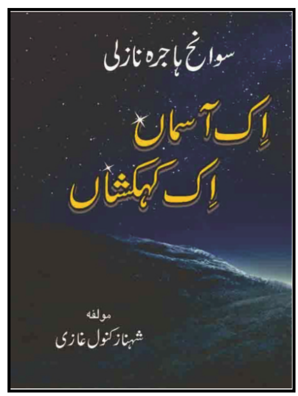

Pages: 348
Price: Rs. 300/-

رابطہ

IQRA EDUCATION FOUNDATION
A-2 Firdaus, 24 S.V. Savarkar Road, Mahim West
Mumbai - 400016 **Cell: 9359210010**

URDU BOOK REVIEW
2878, First Floor, Gali Captain Wali, Kucha Chellan, Darya Ganj, New Delhi - 110002 **Tel.: 011 - 44753890 / 9953630788**

Advtt. 02/2026

ابن صفی کی عصری معنویت پر پانچ اہم کتابیں

ابن صفی: مشن اور ادبی کارنامہ مولف و مرتب: محمد عارف اقبال

اردو میں جاسوسی ادب کے معمار ابن صفی کی ادبی خدمات کا احاطہ کرتے ہوئے ہندوستان میں پہلی بار
ایک جامع کتاب۔ ابن صفی کے پرستاروں اور ابن صفی پر تحقیق کرنے والے اسکالرز کے لیے۔

صفحات: 904 (مجلد)، نیا ایڈیشن: 2016 (حذف و اضافہ شدہ)، قیمت:- 900/ روپے

ISBN 978-93-83239-27-6

اوراقِ پارینہ از: ادریس شاہجہانپوری

جاسوسی دنیا کے پیش لفظ، اداریے اور پیش رس، تفریح کے ساتھ تحقیق کرنے والوں کے لیے
یہ کتاب تحقیق کے نئے در وا کرتی ہے۔

صفحات: 614 (مجلد)، اشاعت اول: 2023، قیمت:- 1000/ روپے

ISBN 978-93-9513-423-95

ابن صفی کا ادبی نصب العین: تحقیقی و تنقیدی مطالعہ مصنف: محمد عارف اقبال

ابن صفی کی تخلیقات میں مستقبل کی آگہی اور زبان و ادب کے گراں قدر علوم پوشیدہ ہیں۔
اردو اکادمی دہلی سے اول انعام یافتہ کتاب

صفحات: 312، اشاعت: 2018، قیمت:- 300/ روپے

ISBN 978-93-83239-81-8

فلسفی ابن صفی تالیف و ترجمہ: ایم طاہر

ابن صفی کے ناولوں سے 283 متنوع موضوعات پر منتخب اقتباسات کا مجموعہ
اردو اقتباس کے ساتھ انگریزی ترجمہ۔ نئی نسل کے لیے گراں قدر تحفہ

صفحات: 144، اشاعت: جون 2022، قیمت:- 250/ روپے

ISBN 978-93-90579-43-3

فنگر پرنٹس (ابن صفی کی قلمی جولانیاں) تحقیق و ترتیب: ادریس شاہجہانپوری

ان تمام ثقہ حضرات کے نام جنہوں نے اپنی خلوتوں میں بیٹھ کر ابن صفی کی تخلیقات سے حظ تو اٹھایا
لیکن روز روشن میں ان کی عظمت کا اعتراف کرنے کا حوصلہ نہ کر سکے۔

صفحات: 808، اشاعت اول: مارچ 2021، قیمت:- 850/ روپے

ISBN 978-93-5457-057-5

رابطہ: اردو بک ریویو نئی دہلی Mob.: 9953630788

URDU BOOK REVIEW QUARTERLY
NEW DELHI-110 002
Ph.: (Office) 011-44753890, Mobile: +91-9953630788

R.N.I. No. 63106 / 95
VOL. XXXII ISSUE NUMBER - 46
April, May, June - 2026

’آل انڈیا یونانی طبّی کانگریس‘

فروغِ طب کی ایک مکمل تحریک ہے آپ بھی ممبر بن کر اس تحریک کا حصہ بن سکتے ہیں!

ممبرشپ حاصل کرنے کے لیے دو عدد فوٹو، ووٹر آئی ڈی یا آدھار کارڈ کی فوٹو کاپی اور ایک ہزار روپے کا ڈی ڈی کسی بھی بینک سے
"ALL INDIA UNANI TIBBI CONGRESS"
کے نام بنوا کر مرکزی دفتر ’آل انڈیا یونانی طبّی کانگریس‘ کو رجسٹرڈ ڈاک سے ارسال کریں۔
درج ذیل اکاؤنٹ میں آن لائن ٹرانسفر بھی کر سکتے ہیں:

Current A/c No. 200110100034672 IFSC: BMCB0000044
Bombay Mercantile Co-Operative Bank Ltd., Branch: Darya Ganj, New Delhi-2

Scan & Pay

مرکزی دفتر

آل انڈیا یونانی طبّی کانگریس

D-49، نیو سیلم پور، نزد شہید اشفاق اللہ خاں پارک،
دہلی-110053

Branch Office

SADAR UNANI CLINIC
3546, Behind Sablok Clinic, Darya Ganj, New Delhi - 110002
Tel.: 011-47524630 / 9810429359 / 7893246825
E-mail: aiutcongress@gmail.com, mahmad1952@yahoo.com
Website: www.aiutc.com

ISSN 0971-9288

Printed, published and owned by **Mohammad Arif Iqbal**, Printed at Asila Offset Printers, 1307-08, Kalan Mahal, Darya Ganj, New Delhi-2 and published from 1739/3 (Basement) New Kohinoor Hotel, Pataudi House, Darya Ganj, New Delhi-110002 *Editor :* **Mohammad Arif Iqbal**